الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خان

بڑے دل والا آدمی ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے
اور چھوٹے دل والا آدمی ہمیشہ ناکام

قیمت فی پرچہ ـــــ تین روپے

اسلامی مرکز کا ترجمان

الرسالہ

جولائی ۱۹۸۲
شمارہ ۶۸

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دھلی ۱۱۰۰۰۶ (انڈیا)

علاقائی اجتماعات

اسلامی مرکز کے نمائندہ اجتماع بھوپال (۱۷-۱۸ اپریل ۱۹۸۲) میں متفقہ طور پر یہ بات طے کی گئی ہے کہ موجودہ سال کے دوران مختلف مقامات پر مرکز کے علاقائی اور مقامی اجتماعات کئے جائیں، اس کے بعد اگلے سال مرکز کا دوسرا سالانہ اجتماع کسی مناسب مقام پر منعقد کیا جائے۔ ان علاقائی یا مقامی اجتماعات میں حسب سہولت مولانا وحید الدین خاں صاحب (صدر اسلامی مرکز) اور مولانا حمید اللہ ندوی (سکریٹری اسلامی مرکز) شریک ہوں گے۔

جہاں جہاں الرسالہ کا حلقہ ہے یا اسلامی مرکز سے اتفاق کرنے والے لوگ ہیں، ان سے گزارش ہے کہ دفتر ماہنامہ الرسالہ کے پتہ پر خط و کتابت کرکے پروگرام طے فرمائیں

——— ادارۂ الرسالہ

منی آرڈر کوپن پر اپنا پورا پتہ تحریر فرمائیں۔ ہر خط و کتابت کے ساتھ خریداری نمبر یا ایجنسی نمبر کا حوالہ ضرور دیں

اسلامی مرکز

کے لئے

تعاون کی اپیل

اسلامی مرکز کا مقصد جدید تقاضوں کے مطابق اسلام کی اشاعت اور ملتِ اسلامیہ کی تعمیر ہے۔ اسلامی مرکز کے ساتھ تعاون کرنا اللہ کے راستے میں تعاون کرنا ہے۔

اسلامی مرکز پچھلے دس سال سے خاموش خدمت میں مصروف ہے۔ مگر یہ کام زیادہ تر انفرادی قربانی کے بل پر ہو رہا ہے۔ ابھی تک اس کے پاس اپنی کوئی عمارت نہیں۔ اس کے متعدد اہم شعبے وسائل کی کمی کی وجہ سے شروع نہ کئے جا سکے۔ وغیرہ

الرسالہ اور دوسرے کام جو جاری ہیں وہ تمام تر خسارے پر چلائے جا رہے ہیں۔ ان حالات میں اسلامی مرکز اپنے ہمدردوں کے تعاون کا شدید طور پر منتظر ہے۔ یاد رکھئے اسلامی مرکز کی اعانت وقت کی سب سے اہم دینی مدیں اعانت ہے۔

اس سلسلہ میں عمومی اعانت کے علاوہ زکوٰۃ وغیرہ کی رقمیں بھی بھیجی جا سکتی ہیں۔ رقم بھیجتے ہوئے اس کی مد کی ضرور صراحت فرمائیں

وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز
دفتر الرسالہ منتقل۔ جمعیۃ بلڈنگ
قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی ۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انسان نے ہمیشہ خدا کو سمجھنے میں بھی غلطی کی ہے اور اپنے آپ کو سمجھنے میں بھی۔ اس نے خدا کو اپنے جیسا سمجھ لیا اور اپنے آپ کو خدا جیسا۔ یہی ہر دور کے انسان کی غلطی رہی ہے۔ ساری انسانی تاریخ اسی غلطی اور اس کے نتائج کی داستان ہے۔

خدا کو اپنے جیسا سمجھنا یہ ہے کہ خدا کو انسانی سطح پر اتار لایا جائے۔ الحاد اور شرک کی تمام قسمیں اسی غلطی کی پیداوار ہیں۔ الحاد بھی خدا کو انسان پر قیاس کرنے کا دوسرا نام ہے اور شرک بھی۔

انسان ہمیشہ باپ اور ماں کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے، وہ کسی جننے والے کے ذریعہ جنا جاتا ہے۔ اس بنا پر گمان کر لیا گیا کہ خدا اگر ہے تو اس کو جننے والا بھی کوئی ہونا چاہیے۔ کسی کو خدا سے پہلے ہونا چاہیے جو خدا کو وجود بخشے۔ اب چونکہ انسان کو خدائے لم یزل کا پیدا کرنے والا کوئی نظر نہ آیا اس لئے اس نے خدا کے وجود کا انکار کر دیا۔ انسان اپنی تخلیق کی صورت میں اپنے خالق کو دیکھ رہا تھا۔ مگر وہ اپنے ایک غلط مفروضہ کی وجہ سے اس کو ماننے پر تیار نہ ہوا۔

جن لوگوں نے خدا کو مانا انھوں نے یہی غلطی دوسرے انداز سے کی۔ انھوں نے دیکھا کہ انسان جب کوئی کام انجام دیتا ہے تو بہت سے لوگوں کی مدد سے انجام دیتا ہے۔ اس بنا پر انھوں نے خدا کے بھی شریک اور مددگار فرض کر لئے۔ انسان کے یہاں بڑے لوگوں کی سفارشیں چلتی ہیں۔ چنانچہ مان لیا گیا کہ خدا کے بھی کچھ مخصوص اور قریبی لوگ ہیں جو خدا کے دربار میں اثر رکھتے ہیں اور خدا ان کی سفارشیں قبول کرتا ہے۔ انسان جذبات سے مغلوب ہوتا ہے۔ وہ اکثر حق کے تقاضوں کو چھوڑ کر جذباتی میلان کے تحت فیصلے کرتا ہے۔ اس پر قیاس کرتے ہوئے یہ عقیدہ بنا لیا گیا کہ خدا محض گروہی تعلق کی بنیاد پر کچھ لوگوں سے ایسا معاملہ کرتا ہے جو معاملہ وہ دوسرے گروہ سے تعلق رکھنے والوں کے ساتھ نہیں کرتا۔ اس قسم کا ہر عقیدہ خدا کی خدائی کی نفی ہے۔ مگر انسان اپنی نادانی سے اکثر اپنے ذہن میں ایسے متضاد خیالات کو جمع کر لیتا ہے جن کا بیک وقت درست ہونا ممکن نہیں۔

اپنے آپ کو خدا جیسا سمجھنا یہ ہے کہ آدمی یہ گمان کرلے کہ وہ اپنی تقدیر کا مالک آپ ہے۔ وہ آزاد ہے کہ جو چاہے کرے اور جو چاہے نہ کرے۔ وہ اپنی زندگی کا اصول آپ وضع کرے اور اپنے حلال و حرام کو خود اپنی عقل سے متعین کرے۔ اس قسم کی ہر کوشش گویا اپنے آپ کو خدا کے مقام پر بٹھانا ہے، جو چیز صرف خدا کا حق ہے اس کا حق دار اپنے آپ کو سمجھنا ہے۔ مگر ایسا ہر گمان اس کائنات میں سراسر باطل ہے۔ کیونکہ انسان صرف ایک عاجز مخلوق ہے، وہ کسی بھی اعتبار سے خالق کا درجہ حاصل نہیں کر سکتا۔

وحید الدین ۱۴ مارچ ۱۹۸۲

جنت کا دروازہ

امام ابن تیمیہ کا قول ہے: دنیا میں بھی ایک جنت ہے، جو شخص دنیا کی جنت کا ذائقہ نہیں چکھے گا وہ آخرت کی جنت میں نہیں جا سکتا (ان فی الدنیا جنۃ من لم یذقھا لم یدخل جنۃ الآخرۃ) دنیا کی جنت یہ ہے کہ وہ اعمال جو آدمی کو آخرت کی جنت میں لے جانے والے ہیں وہ اس کے لئے محبوب بن جائیں۔ جنت میں داخلہ جس طرح آدمی کے لئے انتہائی پسندیدہ ہوگا اسی طرح جنت والے اعمال میں اس کو لذت اور اطمینان حاصل ہونے لگے۔

دنیا کی جنت یہ ہے کہ آدمی دنیا کے دکھائی دینے والے سہاروں سے زیادہ خدا کے نہ دکھائی دینے والے سہارے پر بھروسہ کرنے لگے۔ دنیا کی محبتوں سے زیادہ خدا کی محبت اس کو عزیز ہو اور دنیا کے خوف سے زیادہ خدا کا خوف اس کے لئے اہمیت رکھتا ہو۔ رسول کے بتائے ہوئے طریقے کو قبول کرنا اس کو ہر حال میں پسند ہو خواہ وہ اس کے خلاف کیوں نہ جاتا ہو۔ وہ دنیا کی مصلحتوں کے بجائے آخرت کی مصلحتوں کو اہمیت دے۔ حق کو نظر انداز کرنے کے مقابلہ میں حق کو مان لینا اس کی نظر میں زیادہ محبوب بن جائے۔ بے فکری کے ساتھ قہقہہ لگانے سے بڑھ کر تسکین اس کے دل کو اس وقت ملتی ہو جب کہ وہ اللہ کے لئے آنسو بہا رہا ہو۔ وقار کا سوال اگر سچی بات کو قبول کرنے میں مانع ہو تو اپنے وقار کو مجروح کر کے وہ سچائی کا طریقہ اختیار کرنے پر راضی ہو جائے۔

جب اس کو کسی سے شکایت ہو تو انتقام لینے کے بجائے اس کو معاف کر دینے میں اس کا دل ٹھنڈک پاتا ہو۔ حقوق کو غصب کرنے سے زیادہ اس کو یہ بات پسند ہو کہ وہ دوسروں کے حقوق ادا کرے۔ جب اس کے سینہ میں حسد اور بغض اور گھمنڈ کے جذبات بھڑکیں تو ان کو ظاہر کرنے کے بجائے ان کو کچل ڈالنا اس کو زیادہ مرغوب ہو۔ کسی کے خلاف بری رائے قائم کرنے سے زیادہ اس کو یہ بات پسند ہو کہ وہ اس کے بارے میں اچھی رائے قائم کرے۔

جنت میں جینا یہ ہے کہ آدمی جنتی اعمال میں جی رہا ہو۔ وہ صبر و شکر کا طریقہ اپنائے ہوئے ہو۔ اس کو عجز و تواضع میں لذت ملتی ہو۔ وہ نمائشی کاموں کے بجائے خاموش کاموں میں رغبت رکھتا ہو۔ وہ اپنی آنکھ اور اپنی زبان پر خدا کی نگرانی قائم کئے ہوئے ہو۔ جس آدمی کا حال یہ ہو کہ وہ جنتی اعمال میں اپنے لئے کشش پاتا ہو وہ گویا جنت کی فضاؤں میں جی رہا ہے۔ اور جس آدمی کا حال یہ ہو کہ اس کے برعکس اعمال اس کی دلچسپی کا باعث بنے ہوئے ہوں وہ گویا جہنم میں اپنے صبح و شام بسر کر رہا ہے۔

روزہ کی حقیقت

حدیث میں آیا ہے کہ اللہ نیکیوں کا بدلہ دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک دیتا ہے۔ مگر روزہ خاص اللہ کے لئے ہے اور وہی اس کا (بے حساب) بدلہ دے گا۔ دوسری طرف حدیث میں ہے کہ بہت سے روزہ دار ایسے ہیں جن کو اپنے روزہ سے بھوک پیاس کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔

ایک روزہ اور دوسرے روزہ میں اس فرق کی وجہ کیا ہے جب کہ بظاہر ہر آدمی کا روزہ یکساں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ روزہ کی جو ظاہری شکل ہے وہی اصل روزہ نہیں ہے بلکہ وہ اصل روزہ کی ایک علامت ہے۔ ایک شخص وہ ہے جو علامتی روزہ کو اس کی اصل حقیقت کے ساتھ رکھتا ہے، وہ خدا کے یہاں اس کا بہت بڑا اجر پائے گا۔ اس کے برعکس معاملہ اس شخص کا ہے جو علامتی روزہ کا اہتمام کرے اور حقیقی روزہ کو چھوڑ دے، ایسے آدمی کے روزہ کی خدا کے یہاں کوئی قیمت نہیں۔ جو چیز علامتی نوعیت رکھتی ہو اس کی قدر و قیمت کا تعین ہمیشہ اس کی حقیقت کے اعتبار سے ہوتا ہے نہ کہ محض اس کی ظاہری صورت کے اعتبار سے۔

روزہ کی ظاہری صورت کھانا پینا چھوڑ دینا ہے۔ یہ "چھوڑنا" اس بات کی علامت ہے کہ بندہ خدا کے حکم کے ماتحت ہے۔ وہ ہر اس چیز کو چھوڑنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے جس کو چھوڑنے کا خدا اسے حکم دے۔ حتیٰ کہ اگر وہ حکم دے تو وہ کھانے پینے جیسی ضروری چیزیں بھی اس کی خاطر چھوڑ دے گا۔

اب ظاہر ہے کہ جو شخص ایک مہینہ کے مخصوص اوقات میں کھانا پینا چھوڑ دے۔ مگر خدا کی دوسری منع کی ہوئی چیزوں، مثلاً جھوٹے بول اور جھوٹی کارروائیاں نہ چھوڑے، اس نے گویا علامتی حکم کی تو پیروی کی مگر جو اصلی حکم تھا اس کو نظر انداز کر دیا۔ ایسا آدمی کسی انعام کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

روزہ دار دراصل وہ ہے جس کا روزہ اس کی پوری زندگی کا روزہ بن جائے، جو تمام معاملات میں اس کے اوپر خدا کی لگام لگا دے — اس کی زبان بدخواہی کا کلمہ بولنا چھوڑ دے۔ اس کا ہاتھ ظالمانہ کارروائی کرنے سے رک جائے۔ اس کے پاؤں بے انصافی کے راستوں میں نہ چلیں۔ حدیث کے الفاظ میں، وہ اس گھوڑے کی مانند ہو جائے جو کھونٹے سے بندھا ہوا ہے۔ اس کی رسی جتنی لمبی ہے بس اسی کے دائرہ میں وہ گھومتا رہتا ہے، وہ اس کے باہر نہیں جا سکتا۔

روزہ حقیقۃً برائی کو چھوڑنے کا نام ہے۔ اسی کا روزہ روزہ ہے جو اس کے لئے زندگی کے تمام معاملات میں برائی کو چھوڑ دینے کے ہم معنی بن جائے۔

ہر طرف فریب

آج کی دنیا فریب کی دنیا ہے۔ آج کے انسان کو ایسے نعرے مل گئے ہیں جن سے وہ اپنی شخصی لوٹ کی سیاست کو قومی خدمت کی سیاست ظاہر کر سکے۔ ہر آدمی ایسے الفاظ کا ماہر بنا ہوا ہے جو اس کے ظلم و فساد کو عین حق و انصاف کا روپ دے سکیں۔ ہر آدمی کو ایسے قانونی نکتے ہاتھ آ گئے ہیں جو اس کے جرم کو بے گناہی کا سرٹیفکیٹ عطا کر دیں۔

یہ دنیا پرستوں کا حال ہے۔ مگر خدا پرستوں کا معاملہ بھی اس سے کچھ مختلف نہیں۔ یہاں بھی لوگوں نے ایسے فضائل و مسائل کا خزانہ جمع کر رکھا ہے جو ان کی بے دینی کو دینی کمال کے خانہ میں ڈال دیں۔ جو ان کی بے عملی کو عمل کا شاندار کریڈٹ دے دیں۔

لوگوں نے ایسا خدا دریافت کر رکھا ہے جس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ لوگوں کو ایسا رسول ہاتھ آ گیا ہے جو صرف اس لئے آیا تھا کہ ان کی ساری بداعمالیوں کے باوجود خدا کے یہاں ان کا یقینی سفارشی بن جائے۔ لوگوں کو ایسی آخرت مل گئی ہے جہاں جنت صرف اپنے لئے ہے اور جہنم صرف دوسروں کے لئے۔ لوگوں کو ایسی نمازیں حاصل ہو گئی ہیں جن کے ساتھ کبر اور حسد جمع ہو سکتا ہے۔ لوگوں کو ایسے روزے معلوم ہو گئے ہیں جو جھوٹ اور ظلم سے فاسد نہیں ہوتے۔ لوگوں کو ایسا دین ہاتھ آ گیا ہے جو صرف بحث و مباحثہ کرنے کے لئے ہے نہ کہ عمل کرنے کے لئے۔ لوگوں کو اسلامی دعوت کے ایسے نسخے معلوم ہو گئے ہیں جو ان کی شخصی قیادت اور قومی سیاست کو اسلام کا لباس اوڑھا دیں۔

مگر جھوٹا سونا اسی وقت تک سونا ہے جب تک وہ کسوٹی پر کسا نہ گیا ہو۔ اسی طرح فریب کا یہ کاروبار بھی صرف اس وقت تک ہے جب تک کہ خدا ظاہر ہو کر اپنے انصاف کی ترازو کھڑا نہ کر دے۔ آج امتحان کی آزادی ہے۔ آج آدمی کو موقع ہے کہ جو چاہے کرے۔ مگر جب امتحان کی مدت ختم ہو گی تو آدمی اپنے آپ کو بالکل بے بس پائے گا۔ وہ بولنا چاہے گا مگر اس کے پاس الفاظ نہ ہوں گے کہ وہ بولے۔ وہ چلنا چاہے گا مگر اس کے پاس پاؤں نہ ہوں گے کہ ان کے ذریعہ وہ بھاگ کر کہیں جا سکے۔

یہ سچائی کا دن ہو گا۔ اس دن ہر آدمی کے اوپر سے فریب کا وہ لباس اتر چکا ہو گا جس کو آج وہ پہنے ہوئے ہے۔ ہر آدمی اپنی اس اصل صورت میں نمایاں ہو جائے گا جو فی الواقع اس کی ہے مگر امتحان کی آزادی سے فائدہ اٹھا کر آج وہ اس کو چھپائے ہوئے ہے۔ آدمی کی یہ اصل صورت خدا کے سامنے آج بھی عریاں ہے۔ مگر آخرت کی دنیا میں وہ تمام لوگوں کے سامنے نمایاں ہو جائے گی۔

شناختی کارڈ کے بغیر

دیہات کا ایک لڑکا شہر آیا۔ سڑک پر چلتے ہوئے وہ ایک اسکول کی عمارت کے سامنے سے گزرا۔ یہ اسکول کے جشن کا دن تھا۔ سیکڑوں لڑکے ایک کھڑکی کے سامنے لائن لگائے ہوئے تھے۔ دیہاتی لڑکے نے قریب جاکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کھڑکی پر مٹھائی تقسیم ہو رہی ہے۔ اور ہر ایک اس کو لے کر باہر آرہا ہے۔ دیہاتی لڑکا بھی لائن میں شامل ہو کر کھڑا ہو گیا۔ وہ لائن کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ وہ سمجھتا تھا کہ جب میری باری آئے گی تو مٹھائی کا پیکٹ اسی طرح میرے ہاتھ میں بھی ہوگا جس طرح وہ دوسروں کے ہاتھ میں دکھائی دے رہا ہے۔

لائن ایک کے بعد ایک آگے بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ دیہاتی لڑکا کھڑکی کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے خوش خوش اپنا ہاتھ کھڑکی کی طرف بڑھایا۔ اتنے میں کھڑکی کے پیچھے سے آواز آئی "تمھارا شناختی کارڈ"۔ لڑکے کے پاس کوئی کارڈ نہ تھا۔ وہ کارڈ پیش نہ کر سکا۔ چنانچہ وہ کھڑکی سے ہٹا دیا گیا۔ اب لڑکے کو معلوم ہوا کہ یہ مٹھائی ان لوگوں کو تقسیم ہو رہی تھی جو سال بھر اسکول کے طالب علم تھے نہ کہ کسی ایسے شخص کے لئے جو اچانک کہیں سے آکر کھڑکی پر کھڑا ہو گیا ہو۔

ایسا ہی کچھ معاملہ آخرت میں پیش آنے والا ہے۔ آخرت کا دن خدائی فیصلہ کا دن ہے۔ اس دن سارے لوگ خدا کے یہاں جمع کئے جائیں گے۔ وہاں لوگوں کو انعامات تقسیم ہو رہے ہوں گے۔ مگر پانے والے صرف وہ ہوں گے جنھوں نے اس دن کے آنے سے پہلے پانے کا استحقاق پیدا کیا ہو، جو اپنا "شناختی کارڈ" لے کر وہاں حاضر ہوئے ہوں۔

وہ وقت آنے والا ہے جب کسی آنکھ کے لئے سب سے زیادہ پُرکیف منظر یہ ہوگا کہ وہ اپنے رب کو دیکھے۔ کسی ہاتھ کے لئے سب سے زیادہ لذیذ تجربہ یہ ہوگا کہ وہ اپنے رب کو چھوئے۔ کسی سر کے لئے سب سے زیادہ عزت اور فخر کی بات یہ ہوگی کہ وہ اس کو رب العالمین کے آگے جھکا دے۔ مگر یہ سب کچھ صرف ان لوگوں کے لئے ہوگا جنھوں نے اس دن کے آنے سے پہلے اپنے کو خدا کی نظر عنایت کا مستحق ثابت کیا ہو۔ بقیہ لوگوں کے لئے ان کی غفلت ان کے اور ان کے خدا کے درمیان حائل ہو جائے گی۔ وہ خدا کی دنیا میں پہنچ کر بھی خدا کو نہ دیکھیں گے۔ وہ پانے والے دن بھی اپنے لئے کچھ پانے سے محروم رہیں گے۔

دعوت کا میدان

دوسری جنگ عظیم میں جرمنی اور جاپان ایک فوجی اتحاد میں شامل تھے جس کو محوری طاقتیں (Axis Powers) کہا جاتا تھا۔ ۱۹۴۰ میں اس اتحاد کا نعرہ تھا ـــــــ آج یورپ، کل دنیا:

Today Europe, tomorrow the world

اس مقصد کے لئے جرمنی اور جاپان نے وہ خوفناک جنگ چھیڑی جس کو دوسری جنگ عظیم کہا جاتا ہے۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ فوجی طاقت کے ذریعہ دنیا پر اپنی بالادستی قائم کرنے کا یہ منصوبہ سراسر ناکام رہا۔ تاہم جنگ میں ناکامی نے جرمنی اور جاپان کو سبق دیا۔ انھوں نے اپنے فوجی منصوبہ کو ترک کر کے اپنی ساری توجہ صنعتی اور اقتصادی منصوبوں پر لگادی۔ طریق عمل کی اس تبدیلی کا شاندار نتیجہ برآمد ہوا۔ خاموش عمل نے ان ملکوں کو اقتصادی ترقی کے بلند ترین مقام پر پہنچا دیا۔ آج جرمنی اور خاص طور پر جاپان نے ساری دنیا میں صنعتی بالادستی کا مقام حاصل کر لیا ہے۔ دنیا کے بازار ان کی صنعتی پیداواروں سے پٹے ہوئے ہیں۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لندن کا ایک ہفتہ وار میگزین "نیو سوسائٹی" (۵ فروری ۱۹۸۱) یہ معنی خیز جملہ لکھتا ہے کہ ان قوموں نے اپنے اس خواب کو امن سے پورا کر لیا جو ان کو ۴۰ سال پہلے جنگ کے میدان میں لے گیا تھا:

They have fulfilled in peace the visions
which took them to war 40 years ago.

جدید صنعتی قوموں کے اس واقعہ میں مسلمانوں کے لئے بہت بڑا سبق ہے۔ مسلمان پچھلے سو سال سے اپنے حریفوں کے مقابلہ میں سیاسی اور فوجی لڑائی چھیڑے ہوئے ہیں۔ ان لڑائیوں میں جان و مال کا اتنا زیادہ نقصان ہوا جس کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم بے پناہ قربانیوں کے باوجود ان کا کوئی فائدہ مسلمانوں کو نہیں ملا۔ اب وقت آگیا ہے کہ مسلمان اپنی جدید تاریخ پر نظر ثانی کریں اور اپنے طریق عمل کو بدل دیں۔ مسلمان کے پاس قرآن اور دین حق کی صورت میں اس سے زیادہ بڑی طاقت موجود ہے جس کو جرمنی اور جاپان نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی صورت میں پایا ہے۔ مسلمان اگر سیاسی ہنگاموں اور فوجی مقابلہ آرائیوں کو چھوڑ دیں اور اپنی ساری قوت دیگر اقوام میں اسلام کی اشاعت پر لگائیں تو یقینی طور پر وہ اپنے ان حوصلوں کی تکمیل کر سکتے ہیں جن کی تکمیل میں وہ اب تک ناکام رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان جس چیز کو "جنگ" کے میدان میں ناکام طور پر تلاش کر رہے ہیں وہ "دعوت" کے میدان میں کامیاب طور پر موجود ہے۔ بشرطیکہ وہ اس کو جانیں اور اس کو صحیح طور پر استعمال کریں۔

نمائشی حق پرستی

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پتھر کے اوپر کچھ مٹی جم جاتی ہے۔ اس مٹی کے اوپر سبزہ اگ آتا ہے۔ بظاہر دیکھنے میں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ کوئی کھیت ہو۔ لیکن اگر زور کی بارش ہو جائے تو مٹی سمیت سارا سبزہ بہہ جاتا ہے اور اس کے بعد صرف پتھر کی صاف چٹان باقی رہ جاتی ہے جو ہر قسم کی ہریالی اور نباتات سے بالکل خالی ہوتی ہے۔

یہی معاملہ اکثر انسانوں کا ہے۔ وہ دیکھنے میں بظاہر بالکل ٹھیک معلوم ہوتے ہیں۔ ظاہری طور طریق میں بہت "شاداب" نظر آتے ہیں۔ مگر حالات کا ایک جھٹکا ان کی ساری شادابی اور ہریالی کو ختم کر دیتا ہے اس کے بعد ان کی شخصیت ایک سوکھے پتھر کی مانند ہو کر رہ جاتی ہے۔

ایک شخص جو بات چیت میں شرافت اور معقولیت کی تصویر بنا ہوا تھا وہ عملی تجربہ کے وقت اچانک ایک نامعقول انسان بن جاتا ہے۔ ایک شخص جو انصاف اور انسانیت کے موضوع پر تقریر کر رہا تھا وہ عمل کے موقع پر بے انصافی کا طریقہ اختیار کر لیتا ہے۔ ایک شخص جو مسجد کے رکوع اور سجدہ میں تواضع کا مظاہرہ کر رہا تھا وہ مسجد کے باہر انسانوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں گھمنڈ اور خود پسندی کا مجسمہ بن جاتا ہے۔ ایک شخص جو دوسروں کو عالی ظرفی اور حقوق رسی کی تلقین کر رہا تھا جب اس کا اپنا وقت آتا ہے تو وہ بغض، حسد اور ظلم کے راستہ پر چلنے لگتا ہے

یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں ہر آدمی کی آزمائش ہو رہی ہے۔ یہ آزمائش معمول کے حالات میں نہیں ہوتی بلکہ غیر معمولی حالات میں ہوتی ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ آدمی عین اس وقت ناکام ہو جاتا ہے جب کہ اس کو سب سے زیادہ کامیابی کا ثبوت دینا چاہیے۔

لوگ باتوں میں حق پرستی کا ثبوت دے رہے ہیں حالانکہ حق پرستی وہ ہے جس کا ثبوت عمل سے دیا جائے۔ لوگ دوستی کے وقت خوش اخلاق بنے رہتے ہیں حالانکہ خوش اخلاق وہ ہے جو بگاڑ کے وقت خوش اخلاق ثابت ہو۔ لوگ خدا کے سامنے تواضع کی رسم ادا کر کے مطمئن ہیں حالانکہ کسی کا متواضع ہونا یہ ہے کہ وہ بندوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں تواضع پر قائم رہے۔

چٹان کی مٹی پر کی جانے والی کھیتی نمائشی کھیتی ہے۔ ایسی کھیتی کسی کسان کے کچھ کام آنے والی نہیں۔ سیلاب کا ایک ہی ریلا اس کو جھوٹی کھیتی ثابت کر دیتا ہے۔ اسی طرح نمائشی حق پرستی بھی جھوٹی حق پرستی ہے جس کو قیامت کا سیلاب اس طرح باطل ثابت کر دے گا کہ وہاں اس کے لئے کچھ نہ ہوگا جو اس کا سہارا بنے۔

اختلاف نہیں

سب سے بڑی طاقت اتحاد ہے اور سب سے بڑی کمزوری اختلاف۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں ہر قیمت پر اتحاد کو باقی رکھنے کا حکم ہے، خواہ اس کی خاطر کسی دوسری بڑی چیز کو قربان کر دینا پڑے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون سے نجات پانے کے بعد چالیس دن کے لئے کوہ طور پر گئے۔ اس درمیان میں سامری نے بنی اسرائیل کو گوسالہ پرستی میں مبتلا کر دیا۔ یہ کھلا ہوا شرک تھا۔ حضرت ہارون حضرت موسیٰ کی غیر موجودگی میں بنی اسرائیل کے ذمہ دار تھے۔ انھوں نے بنی اسرائیل کو کافی سمجھایا مگر وہ نہ رکے۔ جب حضرت موسیٰ کوہ طور سے واپس آئے اور قوم کو شرک میں مبتلا دیکھا تو قرآن کے بیان کے مطابق، انھوں نے حضرت ہارون سے سخت باز پرس کی۔ انھوں نے کہا کہ اے ہارون، جب تم نے دیکھا کہ قوم کے لوگ بہک گئے ہیں تو تم کو ان کی اصلاح سے کس چیز نے روکا۔ کیا تم میرے راستہ سے ہٹ گئے۔ حضرت ہارون نے کہا، اے میرے بھائی، میری داڑھی اور میرا سر نہ پکڑئے۔ میں نے بہت کوشش کی۔ مگر مجھ کو اندیشہ ہوا کہ آپ یہ کہیں کہ تم نے بنی اسرائیل کے درمیان پھوٹ ڈال دی اور میری بات یاد نہ رکھی (طٰہٰ ۹۴-۹۲)

حضرت موسیٰ کے پیچھے حضرت ہارون بنی اسرائیل کے نگراں تھے۔ انھوں نے جب دیکھا کہ بنی اسرائیل ایک شخص کے فریب میں آکر شرک کر رہے ہیں تو انھوں نے زبانی نصیحت کی حد تک انھیں روکنے کی پوری کوشش کی مگر وہ نہ رکے۔ حضرت ہارون، جو شریک نبوت تھے، انھوں نے حضرت موسیٰ کو جواب دیا کہ اگر میں زبانی نصیحت سے آگے بڑھ کر عملی مقابلہ کی حد تک جاتا تو مجھے ڈر تھا کہ برائی تو ختم نہ ہوگی البتہ بنی اسرائیل دو ٹکڑوں میں بٹ جائیں گے۔ کچھ لوگ میرا ساتھ دیں گے اور کچھ سامری کا۔ اور پھر دونوں کے درمیان ٹکراؤ شروع ہو جائے گا۔ اس پھوٹ سے بچنے کے لئے میں نے ایسا کیا کہ برائی کے خلاف عملی اقدام نہ کر کے اس وقت کا انتظار کرتا رہا جب کہ آپ واپس آئیں اور پھوٹ کا خطرہ مول لئے بغیر مسئلہ کو حل کیا جا سکے۔ حضرت موسیٰ نے ان کے اس عذر کو تسلیم کر لیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اہل ایمان کے درمیان باہمی تفریق اتنی بری ہے کہ اس سے بچنے کی خاطر بڑی سے بڑی چیز بھی گوارا کی جا سکتی ہے۔ اجتماعی زندگی میں ہر دوسری چیز کی اہمیت اتحاد کے بعد ہے۔ ہر اہم چیز اس وقت غیر اہم بن جاتی ہے جب کہ اس کو حاصل کرنے کے لئے اتحاد و اتفاق کی قیمت دینی پڑے۔

مومن کیسا ہوتا ہے

مومن وہ ہے جو خدا کو اس حیثیت سے پالے کہ وہ سب سے زیادہ خدا سے ڈرے اور سب سے زیادہ خدا سے محبت کرے۔ وہ اپنی سوچ اور اپنے جذبات کا مرکز صرف ایک خدا کو بنالے۔

ایسا آدمی ہر قسم کے سطحی اور منفی جذبات سے اوپر اٹھ جاتا ہے۔ اس کے سینہ میں دوسرے آدمیوں کے لئے خیر خواہی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ جب اپنے کسی بھائی سے اس کی ملاقات ہوتی ہے تو اس کا سلامتی کا جذبہ "السلام علیکم" کی صورت میں اس کے منھ سے نکل پڑتا ہے۔ اس طرح وہ پہلے ہی قدم پر اپنا تعارف اس حیثیت سے کراتا ہے کہ وہ اس کی بھلائی چاہنے والا ہے، وہ اس کی برائی چاہنے والا نہیں ہے۔

جب گفتگو ہوتی ہے تو وہ نرمی اور شرافت کے ساتھ بات کرتا ہے۔ وہ نہ چیختا اور نہ سخت آواز میں بولتا۔ وہ اپنی زبان سے صرف سچی بات نکالتا ہے، جھوٹی بات نہیں نکالتا۔ وہ ایسا نہیں کرتا کہ اس کے دل میں کچھ ہو اور اپنی زبان سے کچھ کہے۔ وہ کسی سے ایسا وعدہ نہیں کرتا جس کو پورا کرنے کے لئے اس کے دل میں پکا ارادہ نہ ہو۔ کوئی ایسی بات پیش آجائے جس سے اس کے دل پر چوٹ لگی ہو تب بھی وہ بیہودہ انداز اختیار نہیں کرتا۔ کوئی چھوٹا ہو تو وہ اس کے ساتھ حقارت کا رویہ اختیار نہیں کرتا۔ کسی کے ساتھ اس نے احسان کیا ہو تو وہ اس کو طعنہ نہیں دیتا۔ وہ اپنے چھوٹوں کے لئے ہمدرد ہوتا ہے اور جو اس سے بڑے ہیں ان سے ادب کے ساتھ پیش آتا ہے۔

مومن کے دل میں خدا کا ڈر سمایا ہوا ہوتا ہے۔ یہ چیز اس کو اس سے روکتی ہے کہ وہ کسی کو ستائے اور کسی کے ساتھ بے انصافی کرے۔ وہ ہر ایک کو اس کا حق دیتا ہے وہ سخت احتیاط کرتا ہے کہ اس کی ذات سے کسی کو کوئی تکلیف پہنچے۔ اس کا وجود کسی دوسرے کے اوپر بوجھ بن جائے۔ وہ کسی کو مصیبت میں دیکھتا ہے تو اس کی مدد کے لئے بے چین ہو جاتا ہے اور اگر وہ مدد کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اس کا دل اس کے لئے دعائیں کرنے لگتا ہے۔ اگر وہ اپنے عمل سے کسی کو نہ دے سکے تو وہ اپنے دل اور اپنی زبان سے اس کو وہ بہترین چیز دیتا ہے جو وہ اسے دے سکتا ہے۔

مومن وہ ہے جو اپنے آپ کو خدا کی نگرانی میں سمجھے، جو یہ سمجھ کر زندگی گزارے کہ اس کو اپنے ہر قول و فعل کا جواب خدا کو دینا ہے۔ جو کمزور کے معاملہ میں شریر نہ بنے کیونکہ ہر کمزور کے ساتھ اس کا خدا کھڑا ہوا ہے۔ جو طاقت ور سے مرعوب نہ ہو، کیونکہ بالآخر ہر ایک خدا کے آگے بے طاقت ہو جانے والا ہے۔

سچائی کو پانے والا

معانی کی دنیا خدا کے جلووں کی دنیا ہے۔ کون ہے جو خدا کے جلووں کو انسانی زبان میں بیان کر سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں الفاظ ختم ہو جاتے ہیں وہاں سے معانی کا آغاز ہوتا ہے۔ جب ہم کسی معنی کو بیان کرتے ہیں تو ہم اس کو بیان نہیں کرتے بلکہ اس کو کچھ گھٹا دیتے ہیں، اس کے اوپر ایک قسم کا لفظی پردہ ڈال دیتے ہیں۔

کسی بامعنی حقیقت کو کوئی آدمی صرف اس کے الفاظ سے سمجھ نہیں سکتا۔ ایک اندھا شخص کسی کے بتانے سے یہ نہیں جان سکتا کہ پھول کیا ہے خواہ اس نے پھول کے تعارف کے لئے انسانی زبان کے تمام الفاظ جمع کر دئے ہوں۔ اسی طرح ایک شخص جس نے معنوی حقیقتوں کو دیکھنے کی صلاحیت اپنے اندر نہ جگائی ہو وہ معنوی حقیقتوں سے باخبر نہیں ہو سکتا، خواہ ڈکشنری کے تمام الفاظ اس کے سامنے دہرا دئے جائیں، خواہ قاموس المعانی کی تمام جلدوں کو اسے پڑھا دیا جائے۔

ہدایت ہر آدمی کی فطرت کی آواز ہے مگر ہدایت اسی کو ملتی ہے جو اپنے اندر اس کی سچی طلب رکھتا ہو۔ جو اپنے اندر سچائی کی کھٹک لئے ہوئے ہو، سچائی جس کی ضرورت بن گئی ہو۔ جو سچائی کو پانے کے لئے اتنا بے قرار ہو کہ وہ اسی کی یاد لے کر سوتا ہو اور اسی کی یاد لے کر جاگتا ہو۔ جو آدمی اس طرح سچائی کا طالب بن جائے وہی سچائی کو پاتا ہے۔

ایسا شخص گویا ہدایت کا نصف راستہ طے کر چکا ہے۔ وہ اپنے اندر چھپے ہوئے عہد الست کی خدائی آوازوں کو سن رہا ہے۔ وہ اپنے اندر اس فطری صلاحیت کو بیدار کر چکا ہے جو معانی کی زبان کو سمجھتی ہے۔ ایسا شخص غیر حقیقی دنیا سے بے رغبتی کی وجہ سے حقیقی دنیا کے اتنا قریب آجاتا ہے کہ وہ فرشتوں کی سرگوشیوں کو سننے لگتا ہے۔

پیغمبر اس تلاش حق کی راہ میں آدمی کا مددگار ہے۔ پیغمبر کے ذریعہ حقیقت کا علم ملنے سے پہلے یہ تمام تجربات آدمی کے اندر مبہم اور مجہول انداز میں ہوتے ہیں۔ اس کے بعد جب پیغمبر کی آواز اس کے اندر داخل ہوتی ہے تو وہ اس کی کتاب فطرت کی تفسیر بن جاتی ہے۔ وہ اپنے اندر چھپے ہوئے غیر ملفوظ اشارات کو ملفوظ زبان میں پالیتا ہے ——— قرآن اور قرآن کو پڑھنے والا دونوں ایک دوسرے کا مثنی بن جاتے ہیں۔ قرآن وہ بن جاتا ہے اور وہ قرآن۔

انسان کا المیہ

یہ جولائی کی ایک حسین صبح تھی۔ سورج ابھی نکلا نہیں تھا مگر آسمان کی وسعتوں میں اس کی پھیلتی ہوئی روشنی بتا رہی تھی کہ وہ جلد ہی نکلنے والا ہے۔ افق پر بادل کے ٹکڑوں کے پیچھے سے پھوٹنے والی سورج کی ابتدائی شعاعیں عجیب رنگ برنگ منظر پیش کر رہی تھیں۔ درختوں کی سرسبزی، چڑیوں کے چہچہے اور صبح کی ہوا کے لطیف جھونکے ماحول کی رعنائی میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔ میری زبان سے بے اختیار نکلا: خدا کی دنیا انتہائی حد تک بامعنی ہے، مگر وہ اس وقت انتہائی حد تک بے معنی ہو جاتی ہے جب کہ اس کے ساتھ آخرت کو شامل نہ کیا جائے۔

دنیا بے حد لذیذ ہے مگر اس کی لذتیں چند لمحے سے زیادہ باقی نہیں رہتیں۔ دنیا بے پناہ حد تک حسین ہے مگر اس کو دیکھنے والی آنکھ بہت جلد بے نور ہو جاتی ہے۔ دنیا میں عزت اور خوشی حاصل کرنا انسان کو کتنا زیادہ مرغوب ہے مگر دنیا کی عزت اور خوشی آدمی ابھی پوری طرح حاصل نہیں کر پاتا کہ اس پر زوال کا قانون جاری ہو جاتا ہے۔ دنیا میں وہ سب کچھ ہے جس کو انسان چاہتا ہے مگر اس سب کچھ کو حاصل کرنا انسان کے لئے ممکن نہیں، حتیٰ کہ اس خوش قسمت انسان کے لئے بھی نہیں جو بظاہر سب کچھ حاصل کر چکا ہو۔

انسان ایک کامل وجود ہے۔ مگر اس کا المیہ یہ ہے کہ اسی کے ساتھ وہ طرح طرح کی محدودیت کا شکار ہے اور بہت سے ناموافق حالات اس کو گھیرے ہوئے ہیں، انسان کی زندگی کامل زندگی ہونے کے باوجود اس وقت تک بے معنی ہے جب تک اس کو ایک ایسی دنیا نہ ملے جو ہر قسم کی محدودیت اور ناموافق حالات سے پاک ہو۔

خدا نے یہ کامل اور ابدی دنیا جنت کی صورت میں بنائی ہے۔ مگر یہ دنیا کسی کو اپنے آپ نہیں مل سکتی۔ اس آنے والی مکمل دنیا کی قیمت موجودہ نامکمل دنیا ہے۔ جو شخص اپنی موجودہ دنیا کو آنے والی دنیا کے لئے قربان کر سکے وہی آنے والی جنتی دنیا کو پائے گا۔ جو شخص اس قربانی کے لئے تیار نہ ہو وہ بھی اگرچہ موت کے بعد ابدی دنیا میں داخل ہوگا۔ مگر اس کے لئے یہ ابدی دنیا حسرتوں اور مایوسیوں کی دنیا ہوگی نہ کہ خوشیوں اور لذتوں کی دنیا۔

رخ صحیح کیجئے

ایک مغربی مفکر نے کہا ہے ـــــ کامیابی کے راستہ کی اکثر رکاوٹوں کو تم نے دور کر لیا ہے اگر تم نے یہ جان لیا ہے کہ محض حرکت اور صحیح رخ پر حرکت میں کیا فرق ہے:

You've removed most of the roadblocks to success when you've learnt the difference between motion and direction.

ہر سرگرمی بظاہر سرگرمی معلوم ہوتی ہے۔ آپ اپنی گاڑی مطلوبہ منزل کی سمت میں چلا رہے ہوں یا منزل کے بالکل الٹی سمت میں اپنی گاڑی دوڑا رہے ہوں، دونوں حالتوں میں دیکھنے والوں کو گاڑی یکساں طور پر حرکت کرتی ہوئی نظر آئے گی۔ مگر دونوں میں اتنا زیادہ فرق ہے کہ ایک حرکت آپ کو ہر آن منزل سے قریب کر رہی ہوگی اور دوسری حرکت ہر آن منزل سے دور۔

انفرادی زندگی کا معاملہ ہو یا اجتماعی زندگی کا، ہمیشہ یہ ضرورت ہوتی ہے کہ حالات اور وسائل کا جائزہ لے کر اس کے مطابق صحیح رخ پر سفر شروع کیا جائے۔ ایسا سفر دیر یا سویر منزل پر پہنچ کر رہتا ہے۔ اس کے برعکس اگر اللہ ٹپ طریقہ پر ایک دوڑ جاری کر دی جائے تو ایسی دوڑ صرف نقصان اور بربادی پر ختم ہوگی۔

اکثر لوگ ایسا کرتے ہیں کہ سوچے سمجھے بغیر ایک کام شروع کر دیتے ہیں یا وقتی جذبات کے اثر سے کوئی کارروائی کرنے لگتے ہیں اور اس کے بعد جب اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا تو دوسروں کی شکایت کرتے ہیں کہ ان کے ضد اور تعصب کی وجہ سے ایسا ہوا۔ حالاں کہ اگر وہ گہرائی کے ساتھ سوچیں تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ انھوں نے کچھ نہ کچھ کرنے کو کرنا سمجھ لیا۔ حالانکہ کرنا صرف وہ ہے جو درست طریقہ پر اور درست سمت میں کیا جائے نہ کہ درست اور نادرست کا لحاظ کئے بغیر بس یوں ہی ہاتھ پاؤں چلانا شروع کر دیا جائے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنی ناکامی کے لئے دوسروں کو الزام دیتا ہے۔ حالاں کہ دوسروں کو اس کے خلاف جو موقع ملا وہ اسی لئے ملا کہ اس نے غلط رخ سے اپنا سفر جاری کیا تھا، اگر اس نے صحیح رخ سے اپنا سفر شروع کیا ہوتا تو اس کی نوبت ہی نہ آتی کہ کوئی اس کے راستہ میں حائل ہو جائے۔ وہ اس کے کامیابی کے سفر کو ناکامی اور بربادی کا سفر بنا دے۔

بڑی کامیابی

انگریزی کے ایک شاعر نے کہا ہے "جس شخص کو دنیا میں بڑا آدمی بننا ہوتا ہے وہ اس وقت کام میں مصروف رہتا ہے جس وقت عام لوگ سو رہے ہوتے ہیں" مطلب یہ ہے کہ ایسا آدمی صرف عام وقتوں ہی میں کام نہیں کرتا بلکہ اس وقت بھی کام کرتا ہے جب کہ لوگ اپنے کام سے فارغ ہو کر آرام کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ لوگوں سے زیادہ کام کرتا ہے اس لئے وہ لوگوں سے زیادہ ترقی حاصل کرتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ زیادہ بڑی کامیابی ہمیشہ زیادہ بڑی محنت کا نتیجہ ہوتی ہے۔

سر سی وی رمن ہندستان کے مشہور سائنس داں گزرے ہیں جن کو نوبل انعام دیا گیا۔ ان سے کسی نے کہا کہ سائنس دانوں نے جو بڑی بڑی دریافتیں کی ہیں ان میں سائنس دانوں کا اپنا کوئی کارنامہ نہیں۔ کیونکہ اکثر دریافتیں محض اتفاق سے حاصل ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر رمن نے جواب دیا: ہاں، مگر ایسا اتفاق صرف ایک سائنس داں کو پیش آتا ہے:

سائنسی دریافتیں (مثلاً بجلی کی دریافت) اکثر اس طرح ہوئی ہیں کہ ایک سائنس داں اپنی تجربہ گاہ میں تحقیق کر رہا ہے۔ تحقیق کرتے کرتے اچانک ایک چیز چمک اٹھی۔ اب سائنس داں نے اس کی کھوج شروع کی۔ یہاں تک کہ وہ ایک نئی دریافت تک پہنچ گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نئی دریافت اگرچہ اچانک ہوتی ہے۔ مگر یہ اچانک دریافت اسی شخص کے حصہ میں آتی ہے جو مسلسل تحقیق و تلاش میں لگا ہوا ہو۔ کوئی آدمی بے کار بیٹھا ہوا ہو تو اس کے ساتھ ایسا خوش قسمت لمحہ کبھی نہیں آئے گا۔

یہی معاملہ زندگی کی تمام ترقیوں کا ہے۔ بڑی کامیابی اکثر کسی کے حصہ میں اس طرح آتی ہے کہ وہ اپنے کام میں لگا ہوا ہے۔ وہ محنت میں رات دن ایک کئے ہوئے ہے۔ پھر اچانک ایک موقع سامنے آتا ہے اور وہ اس کو استعمال کر کے آگے بڑھ جاتا ہے۔ یہ موقع اچانک آتا ہے اور پہلے سے بتائے بغیر آتا ہے۔ کوئی شخص دن کو کام کرے اور رات کو غافل ہو تو رات کو وہ موقع آئے گا اور وہ اس سے فائدہ اٹھانے سے محروم رہے گا۔ اسی طرح کوئی شخص رات کو کام کرے اور دن کو غافل ہو تو دن میں وہ موقع آئے گا اور وہ اس سے فائدہ اٹھانے سے محروم رہ جائے گا۔ بڑی کامیابی ہمیشہ بڑی جدوجہد سے حاصل ہوتی ہے۔ بڑی کامیابی حاصل کرنے کی دوسری کوئی صورت نہیں۔

کوئی فرق نہیں

ایک آدمی ایک درخت کے نیچے آرام کر رہا تھا۔ اس کا ایک دوست ادھر سے گزرا۔ اس نے پکار کر کہا "میرے بھائی، تم کیوں نہیں جاتے کہ کچھ لکڑیاں کاٹ کر لاؤ۔"

"کس لئے" سوئے ہوئے آدمی نے پوچھا۔

"تاکہ تم ان لکڑیوں کو بیچ کر پیسہ حاصل کرو اور اپنے لئے ایک گدھا خریدو اور پھر لکڑی کو گدھے پر لاد کر گھر گھر بیچو۔ اس طرح ایک وقت آئے گا کہ تم اور نفع کما کر ایک ٹرک خرید لو گے۔ پھر تم اور ترقی کرو گے اور تمھارے یہاں آرہ کی مشین اور بہت سے ٹرک ہو جائیں گے۔"

"یہ سب کس لئے"، سونے والے نے دوبارہ پوچھا۔

"تم لکھ پتی ہو جاؤ گے اور آرام سے رہو گے"

"پھر تمھارا کیا خیال ہے، اب میں کیا کر رہا ہوں"

یہ ایک واقعہ ہے کہ جو آرام ایک آدمی کوٹھی بنا کر حاصل کرنا چاہتا ہے وہی آرام ایک آدمی درخت کے سایہ میں بھی حاصل کر رہا ہے۔ دیکھنے والوں کے نزدیک ضرور دونوں میں فرق ہے۔ مگر خود آرام کرنے والے کے لئے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ بلکہ درخت کے نیچے سونے والا جس سکون میں ہے وہ کوٹھی والے کو شاید میسر نہیں۔

ایک تاجر ایک بار مجھے اپنا نیا مکان دکھانے کے لئے لے گئے۔ کافی بڑا دو منزلہ مکان تھا۔ گھر کے ہر چھوٹے بڑے کے لئے الگ الگ کمرے اور اس کے ساتھ تمام ضروری سہولتیں مہیا تھیں۔ سارے گھر میں قیمتی قالین بچھے ہوئے، تمام دروازے اور کھڑکیاں خوبصورت پردوں سے ڈھکی ہوئی۔ ہر کمرہ میں اعلیٰ درجہ کا فرنیچر۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پورا گھر جدید سامانوں کی ایک نمائش گاہ ہے۔

مگر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں ایک خوبصورت قید خانہ میں بند کر دیا گیا ہوں۔ یہ مکان ایک کھلی جگہ پر تھا مگر وہ قدرت کی ہر چیز سے خالی اور قسم قسم کی مصنوعی چیزوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہر طرف بجلی کی روشنی کا اعلیٰ انتظام تھا مگر سورج کی روشنی کو اجازت نہ تھی کہ وہ بند مکان میں داخل ہو۔ ہر کمرہ میں ایر کنڈیشنر لگا ہوا تھا مگر قدرتی ہوا کا کہیں گزر نہ تھا۔ انسانی آرٹ کے نمونے دیوار پر تھے مگر قدرت کے آرٹ کو دیکھنے کے لئے وہاں کوئی کھڑکی کھلی ہوئی نہ تھی۔ کمرہ میں میوزک کا انتظام تھا مگر باہر کے درخت پر چہچہانے والی چڑیوں کی آواز سننے کے تمام راستے بند تھے ـــــ جدید تمدن نے انسان کو قدرت سے کتنا دور کر دیا ہے۔

کتنا فرق

خنساء (تماضر بنت عمرو بن الحارث) عرب کی مشہور شاعرہ تھی۔ زمانۂ جاہلیت میں اس کے بھائی کا انتقال ہوگیا۔ یہ حادثہ اس کے لئے اتنا سخت ثابت ہوا کہ وہ اس کے اوپر چھاگیا۔ وہ ہر وقت غم میں ڈوبی رہتی اور دردناک اشعار پڑھ پڑھ کر روتی رہتی۔

خنساء نے بعد کو اسلام قبول کیا۔ حضرت عمر کی خلافت کے زمانہ میں قادسیہ کی جنگ چھڑی تو اس نے اپنے چار لڑکوں کو جہاد کے لئے روانہ کیا۔ یہ چاروں لڑکے جنگ قادسیہ میں شہید ہوگئے۔ جب اس نے اس حادثہ کی خبر سنی تو اس کی زبان سے نکلا:

الحمد للہ الذی شرفنی بقتلهم فی سبیل نصرۃ الدین، واعلاء کلمۃ الاسلام۔ وارجو ان یلحقنی بهم فی مستقر رحمته

اس خدا کا شکر ہے جس نے مجھے یہ عزت دی کہ میرے لڑکے نصرت دین اور اعلاء کلمۃ الاسلام کی راہ میں مارے گئے۔ اور میں امید کرتی ہوں کہ خدا مجھے اپنی رحمت کے مقام پر ان سے ملائے گا۔

ایک عورت جو اسلام سے پہلے اپنے بھائی کی موت کو برداشت نہ کرسکی تھی وہی عورت اسلام کے بعد اپنے چار بیٹوں کے قتل کی خبر کو اتنے اطمینان کے ساتھ سنتی ہے کہ اس کی زبان سے شکر کا کلمہ نکل جاتا ہے۔ اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس فرق کی وجہ اسلام اور جاہلیت کا فرق ہے۔ جاہلیت زدہ انسان دنیا میں جیتا ہے۔ دنیا کا فائدہ دیکھ کر اس کا دل بڑھتا ہے۔ اور دنیا کا نقصان ہو تو اس کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کے برعکس اسلام آدمی کی نظر میں آخرت کو اہم بنا دیتا ہے۔ وہ انھیں چیزوں کو اہمیت دیتا ہے جو آخرت کے لحاظ سے اہم ہوں اور جن چیزوں کی اخروی اہمیت نہ ہو وہ اس کی نظر میں اتنی غیر اہم بن جاتی ہیں گویا ان کی کوئی حقیقت ہی نہیں۔

اسلام آدمی کے اندر ہمت پیدا کرتا ہے، وہ خدا کے سوا ہر دوسری چیز سے آدمی کو بے خوف کر دیتا ہے۔ اسلام آدمی کے اندر محدود بیت نگاہ کو ختم کر دیتا ہے۔ حتی کہ وہ ایک امکان کے خاتمہ کے بعد دوسرے امکان کو دیکھنے لگتا ہے، وہ ایک محرومی میں مبتلا ہو کر دوسری کامیابی کا دروازہ اپنے سامنے کھلا ہوا پاتا ہے۔ اسلام آدمی کے ذہن کو اس طرح روشن کر دیتا ہے کہ وہ وہاں بھی دیکھ لے جہاں لوگوں کو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ وہ وہاں سے بھی اپنے لئے کام کی بات پالے جہاں لوگوں کو کوئی کام کی بات نظر نہیں آتی۔ اسلام اور غیر اسلام میں اتنا ہی فرق ہے جتنا اجالے اور اندھیرے میں۔

نادانی کی سیاست

پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴) میں ایک طرف برطانیہ اور اس کے حلیف تھے جن کو اتحادی طاقتیں (Allied Powers) کہا جاتا تھا۔ دوسری طرف جرمنی اور اس کے حلیف تھے جن کو محوری طاقتیں (Axis Powers) کہا گیا۔ اس جنگ میں ترکوں نے اتحادیوں کے خلاف جرمنی کا ساتھ دیا۔ اسی زمانہ میں لندن ٹائمس نے اپنے ایک مضمون میں ترکوں کو مشورہ دیا کہ وہ جنگ سے الگ رہیں۔ مولانا محمد علی اس جنگ میں اپنے دشمن انگریز کو ان کے مخالفوں کے ہاتھوں شکست کھاتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے، چنانچہ وہ لندن ٹائمس کے مشورہ کو پڑھ کر بے قابو ہو گئے۔ انھوں نے چالیس گھنٹہ کی لگاتار محنت کے بعد اپنے انگریزی اخبار کامریڈ کے لئے ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا: ترکوں کا انتخاب (Choice of the Turks)

مولانا محمد علی کے اس مشہور ترین مضمون میں ترکوں کو پُرزور مشورہ دیا گیا کہ وہ جرمنی کے ساتھ ہو کر انگریزوں کے خلاف جنگ کرنے کے فیصلہ پر قائم رہیں۔ مولانا محمد علی کے نزدیک دو ممکن راستوں میں سے صحیح راستہ ترکوں کے لئے یہ تھا کہ وہ انگریزوں کے مقابلہ میں جرمنوں کے محاذ میں شامل ہو جائیں۔

مگر جنگ کا نتیجہ مولانا محمد علی کی خواہشوں کے خلاف نکلا۔ جنگ ختم ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ جرمنوں کی شکست کے ساتھ ترکوں کے لئے بھی شکست کا پیغام بن کر آئی ہے۔ اس کے بعد انگریزوں نے ترکوں کے ساتھ وہی سلوک کیا جو کوئی فاتح قوم مفتوح قوم کے ساتھ کرتی ہے۔ اب مولانا محمد علی دوبارہ بے تاب ہو گئے۔ وہ مسلمانوں کا ایک وفد لے کر لندن گئے تاکہ ہندستان کے انگریز وائسرائے لارڈ چیمسفورڈ سے ملاقات کریں۔ مگر وائسرائے نے ان سے ملاقات نہ کی اور انھیں ناکام واپس آنا پڑا۔ اس کے بعد وہ دوسرے وفد کے ساتھ ۱۹۲۰ میں دوبارہ لندن گئے اور انگریزی قوم اور انگریز حکمرانوں کو مسلمانان ہند کے "جذبات" سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ وہاں انھوں نے چند تقریریں کیں، صرف یہ سننے کے لئے کہ آپ نے جب نازک وقت میں ہمارے جذبات کا لحاظ نہ کیا تو آپ کیسے امید رکھتے ہیں کہ ہم آپ کے جذبات کا لحاظ کریں گے۔

کوئی فاتح قوم جنگ کے بعد ایسے گروہ سے رعایت نہیں کرتی جس نے جنگ کے زمانہ میں اس کے دشمنوں کا ساتھ دیا ہو۔ چنانچہ برطانیہ کی اعلیٰ سیاسی شخصیتوں نے مولانا محمد علی سے ملاقات بھی نہ کی۔ اب فیصلہ کی طاقت اتحادیوں کی طرف جا چکی تھی ان کے نزدیک محمد علی کا کیس اب حق کا کیس نہیں تھا بلکہ مجرم کی چیخ پکار کا کیس تھا۔ انھوں نے ترکوں کی مخالفانہ کارروائی کا یہ بدلہ لیا کہ ترکی کے حصے بخرے کر کے ترکی کی عظیم خلافت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔

تعبیر کا فرق

"قم" کے معنی عربی زبان میں "اٹھو" کے ہیں اور قم ایران کے ایک شہر کا نام بھی ہے۔ ایک پرانا لطیفہ ہے کہ شہر قم کے قاضی صاحب کو ان کے حاکم کا ایک حکم نامہ ملا جس میں عربی زبان میں یہ تحریر تھا: یا قاضی قم لقد شبتَ فقم۔ اس جملہ کا لفظی مطلب یہ ہے کہ اے قم کے قاضی، اب تم بوڑھے ہو گئے اس لئے اٹھو (اپنا عہدہ چھوڑ دو) یہ حکم نامہ جب قاضی قم کو ملا تو اس نے کہا: "قتلنی حبّ الامیر للقافیۃ" (امیر کی قافیہ پسندی نے مجھے مار ڈالا)

قاضی صاحب کی نظر قُم پر گئی، شبتَ پر نہیں گئی۔ اگر وہ شبتَ کے لفظ پر غور کرتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ ان کو عہدۂ قضا سے ہٹانے کی اصل وجہ ان کا بڑھاپا ہے نہ کہ قُم کا قافیہ۔ امیر کو انھیں بڑھاپے کے سبب سے اس ذمہ دارانہ منصب سے ہٹا کر کسی دوسرے جواں سال آدمی کو وہاں رکھنا تھا۔ یہ محض اتفاقی بات تھی کہ وہ شہر قُم کے قاضی تھے اور اس بنا پر حسن تعبیر کے لئے اس نے اپنے حکم کے لئے مذکورہ الفاظ استعمال کر لئے۔ اگر وہ قم کے بجائے کسی اور شہر کے قاضی ہوتے تب بھی وہ ان کو معزول کرتا۔ البتہ اس صورت میں اس کے حکم کے الفاظ دوسرے ہوتے۔

جب بھی ایک بات کہی جائے تو اس کا کوئی جزء اصلی ہوتا ہے اور کوئی جزء اتفاقی۔ کوئی چیز اصل مقصود کلام کے طور پر آتی ہے اور کوئی اتفاقاً کلام کا جزء بن جاتی ہے۔ آدمی کسی کلام کی حکمت کو اسی وقت سمجھ سکتا ہے جب کہ وہ الفاظ کے اس فرق کو ملحوظ رکھ کر کلام کا مفہوم متعین کرے۔ اس کے برعکس اگر وہ اس فرق کو ملحوظ نہ رکھے تو وہ سخت غلطی کرے گا۔ وہ بظاہر کلام کو سمجھتے ہوئے بھی کلام کو نہیں سمجھے گا۔ وہ نہ کہنے والے کے ساتھ انصاف کرے گا اور نہ خود اپنے ساتھ۔

مذکورہ قاضی صاحب اتنے نادان نہیں ہو سکتے کہ وہ اس راز کو نہ سمجھ سکیں۔ یہ واقعہ اگر دوسرے شخص سے متعلق ہوتا تو وہ فوراً اس کو جان لیتے۔ مگر معاملہ ان کی اپنی ذات کا تھا اس لئے وہ اس کی حقیقت تک نہ پہنچ سکے۔ جب بھی کوئی آدمی نفسیاتی پیچیدگی میں مبتلا ہو تو وہ حقیقت پسندانہ انداز میں سوچ نہیں پاتا اور اس بنا پر اصل معاملہ کو سمجھنے میں اسی طرح ناکام رہتا ہے جس طرح قاضی صاحب ناکام رہے۔

دین غریب، دین معروف

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی مکہ کے منکرین کے سامنے ایمان و اسلام کا ذکر کرتے تو وہ فخر کے ساتھ کہتے کہ ہم تو اس سے بڑا دینی کام کر رہے ہیں، ہمیں تمھارے اسلام کی ضرورت نہیں۔ ہم مسجد حرام کا انتظام کرتے ہیں، ہم حاجیوں کو پانی پلاتے ہیں (نعمر المسجد الحرام ونسقی الحاج) اس پر قرآن میں یہ آیت اتری:

اجعلتم سقایۃ الحاج وعمارۃ المسجد الحرام کمن ءامن باللہ والیوم الآخر وجٰھد فی سبیل اللہ لایستوون عند اللہ واللہ لایھدی القوم الظالمین۔ الذین آمنو وھاجروا وجٰھدوا فی سبیل اللہ باموالھم وانفسھم اعظم درجۃ عند اللہ واولٰئک ھم الفائزون (التوبہ)

کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کا انتظام کرنے کو اس کے برابر کر دیا جو اللہ اور آخرت پر ایمان لایا اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ اللہ کے نزدیک یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔ جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد کیا ان کا درجہ اللہ کے یہاں بڑا ہے اور وہی ہیں کامیاب ہونے والے

پیغمبر اسلام کی دعوت اپنے ابتدائی زمانہ میں مجرد دعوت تھی جس کی پشت پر نظری سچائی کے سوا اور کوئی چیز موجود نہ تھی۔ دوسری طرف بیت اللہ کی حیثیت ایک ایسے ادارہ کی تھی جس کے ساتھ در و دیوار کی عظمتیں اور تاریخ کی روایتیں شامل ہو چکی ہوں۔ بیت اللہ کے ساتھ اپنے کو وابستہ کرنے کی اہمیت اتنی معلوم اور مسلّم تھی کہ وہ فخر کا نشان بنی ہوئی تھی۔ جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر ایمان لانا ایک ایسی چیز پر ایمان لانا تھا جس نے اپنی اہمیت کو ابھی محسوسات کے روپ میں ظاہر نہ کیا ہو۔

اس فرق کو ایک لفظ میں اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ ایک چیز ہے نصرتِ دعوت اور دوسری چیز ہے نصرتِ ادارہ۔ نصرت دعوت ہر زمانہ میں انسان کے لئے مشکل ترین کام رہا ہے۔ اس کے برعکس نصرت ادارہ ہر دور کے انسانوں کو سب سے زیادہ آسان کام معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ دعوت کے ساتھ ہمیشہ صرف نظری صداقت ہوتی ہے اور ادارہ کے ساتھ مادی اہمیت کی چیزیں شامل ہو جاتی ہیں۔ مگر خدا کے یہاں عزت اور بڑائی انھیں لوگوں کے لئے ہے جو سچائی کا ساتھ اس وقت دیں جب کہ وہ صرف ایک دعوت ہو۔ ادارہ بننے کے بعد اس کا ساتھ دینا خدا کی نظر میں کوئی قیمت نہیں رکھتا۔ دعوت کا ساتھ دینا خدا کا ساتھ دینا ہے اور ادارہ کا ساتھ دینا مادی عظمتوں کا ساتھ دینا۔

قدرت کے آغوش میں

یہ ایک پہاڑی مقام ہے۔ میں سطح سمندر سے چھ ہزار فٹ کی بلندی پر بیٹھا ہوں۔ ہری گھاس کی قدرتی مخمل ہمارا فرش ہے۔ ہمارے چاروں طرف آفاقی حسن کے مناظر پھیلے ہوئے ہیں۔ سبزہ سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں، قدرتی چشموں کی موسیقی، فرحت بخش ہوا کے جھونکے، سورج کی سہانی کرنیں، نیلا آسمان اور اس میں جگہ جگہ سفید بادل کی گل کاریاں، چڑیوں کے چہچہانے کی لطیف آوازیں، تمدن کے ہنگاموں اور آلائشوں سے دور قدرت کی خاموش فضا، یہ سب چیزیں عجیب ناقابل بیان منظر پیدا کر رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوا جیسے کائنات کا حسین چہرہ اپنے حسین تر خالق کا آئینہ بن گیا ہو۔

میری زبان سے بے اختیار نکلا ——— خدایا، تو اس سے زیادہ ہے کہ میں اپنے لفظوں میں تجھ کو بیان کر سکوں۔ میں نے تیری حمد میں جو کچھ کہا وہ جھوٹ تھا۔ کیونکہ میں نے تیری بے پایاں ہستی کو بیان نہیں کیا بلکہ اس کو گھٹا دیا۔ میں نے تیرا چرچا کیا مگر میں نے تیرا چرچا نہیں کیا، کیونکہ تو اس سے بلند ہے کہ تیرا چرچا کرنے کے لئے کوئی شخص الفاظ پا سکے۔ میں نے تیری عبادت کی، مگر میں نے تیری عبادت نہیں کی، کیونکہ تو اس سے برتر ہے کہ کوئی انسان تیری عبادت کا حق ادا کر سکے۔

پہاڑ کا ہمالیائی ماحول خدا کے جلال و جمال کو اس طرح نمایاں کر رہا تھا کہ اس کے مقابلہ میں اپنی ہر چیز حقیر اور بے قیمت نظر آئی۔ یہاں بیٹھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آدمی خدا کی آفاقی دنیا میں پہنچ گیا ہے۔ تمام منفی جذبات اور سطحی داعیات خدا کی وسیع دنیا میں تحلیل ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ خود پرستی کائنات کی عظمتوں کے سامنے اپنا وجود کھوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اللہ کی عقیدت کے سوا دوسری تمام عقیدتیں اور پرستاریاں ایسی ہو جاتی ہیں جیسے مالک کائنات کی بارگاہ میں ان کو جگہ نہ مل رہی ہو۔ دنیا پرستی یہاں کی جنتی فضاؤں میں ایک ایسی حقیر چیز بن جاتی ہے جس پر آدمی کو خود شرم آنے لگے۔

میں کائناتی حسن کے اس ماحول میں گم تھا کہ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ خدا کی یہ دنیا ہی خدا کے ذکر کی سب سے موزوں جگہ ہے۔ یہاں کی ربانی فضا ہی اس کام کے لئے سب سے زیادہ مناسب ہے کہ یہاں وہ ربانی انسان پیدا کئے جائیں جو سارے عالم کو کونوا ربانیین (ربانی بنو) کی دعوت دے سکیں۔ یہاں کے جنتی پڑوس ہی میں وہ انسان تیار کئے جا سکتے ہیں جو لوگوں کو یہ پیغام دیں کہ جنت کی طرف دوڑو

اور جہنم سے اپنے آپ کو بچاؤ۔

میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا: جی چاہتا ہے کہ یہاں ایک تربیتی ادارہ قائم ہو جس میں لوگ دس دس، بیس بیس کی تعداد میں آکر شریک ہوں۔ یہاں کی آفاقی فضاؤں میں ہی وہ تربیت گاہ بن سکتی ہے جس میں وہ انسان پیدا کرنے کی کوشش کی جائے جو خدا میں جیتے ہوں۔ جو انسانی پستیوں کے بجائے خدائی بلندیوں میں اپنی روح کی غذا پا رہے ہوں۔ جو فانی دنیا کے بجائے ابدی دنیا میں سانس لیتے ہوں۔

کائنات میں غور و فکر آدمی کو خدا سے جوڑتا ہے، جب کہ انسانی بحثوں میں خوض سے صرف ذہنی موشگافیاں وجود میں آتی ہیں۔ ایک کے اندر معرفتِ خداوندی کی غذا ہے اور دوسرے کے اندر اختلاف و انتشار کا سامان۔ اس قسم کا پہاڑی مقام جو قدرتی مناظر سے گھرا ہوا ہو وہ یقیناً سب سے زیادہ موزوں جگہ ہے جہاں خدا کے بندوں کو خدا پرستی کا درس دیا جائے۔

یہاں ہر طرف قدرتی چشمے ہیں جن سے سال بھر شفاف پانی ابلتا رہتا ہے۔ ایسے ماحول میں جب کوئی کہنے والا کہے کہ اللہ کا فیضان ہدایت ہر وقت تمھارے لئے برس رہا ہے اس میں سے اپنا حصہ لو تو پانی کے بہتے ہوئے چشمے اپنی دھیمی موسیقی کے ساتھ اس کی تائید کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جب آپ کہیں کہ اللہ سب سے بڑا ہے، اس کی بڑائی کو مان کر اس کے آگے جھک جاؤ تو پہاڑوں کی بلندیاں اپنی خاموش زبان میں بول پڑتی ہیں کہ کہنے والے نے سچ کہا۔ جب آپ لوگوں سے کہیں کہ ایمان کو اس طرح اپناؤ کہ وہ تمھاری پوری ہستی کو تر و تازہ کر دے تو چاروں طرف اگے ہوئے سرسبز شاداب درخت اس قول کی مجسم تفسیر بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جب آپ کہیں کہ اختلاف اور شکایت سے اوپر اٹھ کر زندگی گزارو تو آسمان کی بلندیاں اپنے آفاقی پھیلاؤ کے ساتھ اس کی خاموش تصدیق بن جاتی ہیں۔ جب آپ کہیں کہ ہر آدمی کو چاہئے کہ وہ دوسروں سے ٹکرائے بغیر اپنی سرگرمیوں کو جاری کرے تو یہاں کی کھلی ہوئی کائنات اپنے پورے وجود کے ساتھ پکار اٹھتی ہے کہ مجموعی ترقی کا راز بلاشبہ اس دنیا میں یہی ہے، اس کے سوا اور کسی چیز میں نہیں۔

خدا سے قریب ہونے کی سب سے بہتر جگہ خدا کی کھلی ہوئی کائنات ہے مگر لوگوں کا حال یہ ہے کہ خدا کی قربت کو کوئی شخص تنگ و تاریک حجروں میں تلاش کر رہا ہے اور کوئی سیاست و تمدن کے ہنگاموں میں کوئی اپنے مادی مسائل میں الجھا ہوا ہے اور کوئی اپنے قومی مسائل میں۔ انسانی روح کی غذا دراصل واقعات خداوندی میں رکھی گئی ہے مگر لوگ واقعات انسانی کو اپنی روح کی غذا بنائے ہوئے ہیں۔ ایسی حالت میں خدا کی زمین اگر ربانی انسانوں سے خالی ہو تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں

یہ بگاڑ ہے یا اصلاح

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: کہو کہ خدا اس پر قادر ہے کہ وہ تم پر کوئی عذاب بھیج دے، تمہارے اوپر سے یا تمہارے قدموں کے نیچے سے، یا تم کو گروہ گروہ کرکے بھڑا دے اور تمہارے ایک کو تمہارے دوسرے کی طاقت کا مزہ چکھائے۔ دیکھو ہم کیونکر اپنی نشانیاں طرح طرح سے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھیں (الانعام ۶۵)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ کسی قوم پر نافرمانی کے سبب سے خدا کا جو عذاب آتا ہے وہ تین صورتوں میں آتا ہے۔ ایک وہ جو اوپر سے آئے۔ جیسے پتھر برسنا یا طوفانی ہوا اور شدید بارش۔ دوسرے وہ جو پاؤں کے نیچے سے آئے، جیسے زلزلہ یا سیلاب وغیرہ۔ تیسرا وہ جس کو داخلی عذاب کہا جا سکتا ہے، یعنی باہمی ٹکراؤ اور آپس کی خوں ریزی۔ پہلا اور دوسرا عذاب ہمیشہ ان قوموں پر آتا ہے جن پر نبی کے ذریعہ اتمام حجت کیا گیا ہو، اس کے باوجود وہ منکر بنی رہے۔ ختم نبوت کے بعد اب چونکہ کوئی نبی آنے والا نہیں۔ اس لئے اب امت مسلمہ کے لئے ان دونوں عذابوں کا خطرہ نہیں۔ البتہ تیسری قسم کے عذاب سے وہ مامون نہیں ہے۔ جب بھی اس امت میں غفلت اور سرکشی بڑھے گی وہ اس تیسرے عذاب کی لپیٹ میں آجائے گی۔

ایک روایت الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ مختلف کتب حدیث میں آئی ہے۔ حافظ ابن کثیر نے مذکورہ آیت کی تفسیر کے تحت احمد، نسائی، ابن حبان اور ترمذی کے حوالے سے جو روایت درج کی ہے اس کو ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

عن خباب بن الارت انہ قال وافیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی لیلۃ صلاھا کلھا حتی کان مع الفجر فسلم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من صلاتہ فقلت یارسول اللہ لقد صلیت اللیلۃ صلاۃ مارأیتک صلیت مثلھا فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجل انھا صلاۃ رغب ورھب۔ سألت ربی عزوجل فیھا ثلاث خصال فاعطانی اثنتین ومنعنی واحدۃ۔ سألت ربی عزوجل ان لا یھلکنا بما اھلک بہ الامم قبلنا فاعطانیھا۔ وسألت ربی عزوجل ان لا یظھر علینا عدوا من غیرنا فاعطانیھا۔ وسألت

حضرت خباب بن ارت کہتے ہیں کہ میں اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا جب کہ آپ نے ساری رات نماز پڑھی۔ یہاں تک کہ جب فجر کا وقت آگیا تو آپ نے سلام پھیر کر اپنی نماز ختم کی۔ میں نے کہا، اے خدا کے رسول، آج کی رات آپ نے ایسی نماز پڑھی جیسی نماز پڑھتے ہوئے میں نے اس سے پہلے آپ کو نہ دیکھا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں، وہ ڈر اور اشتیاق کی نماز تھی۔ میں نے اس میں اپنے رب سے تین باتیں مانگیں۔ اس نے دو باتیں مجھ کو دے دیں اور ایک سے منع فرمایا۔ میں نے اپنے رب سے یہ مانگا کہ وہ ہم کو اس طرح ہلاک نہ کرے جس طرح پچھلی

ربی عزوجل ان لا یلبسنا شیعا فمنعنیها

امتیں ہلاک کی گئیں۔ یہ اس نے مجھ کو دے دیا۔ پھر میں نے اپنے رب سے مانگا کہ وہ ہمارے اوپر ہمارے باہر کے دشمن کو (کامل طور پر) مسلط نہ کرے۔ یہ بھی اس نے مجھ کو دے دیا۔ پھر میں نے اپنے رب سے مانگا کہ وہ ہم کو گروہوں میں نہ بانٹے۔ اس کی قبولیت سے اس نے انکار کر دیا۔

ایک اور روایت میں مزید یہ الفاظ ہیں کہ میں اپنی امت پر گمراہ قائدین کے سوا کسی اور سے نہیں ڈرتا۔ جب میری امت میں ایک بار تلوار چل جائے گی تو وہ قیامت تک اس سے اٹھائی نہ جائے گی (انی لا اخاف علی امتی الا الائمة المضلین فاذا وضع السیف فی امتی لم یرفع عنهم الی یوم القیامة)

امت مسلمہ کے بگاڑ پر ہونے کی کم از کم ایک یقینی پہچان یہ ہے کہ وہ گروہوں میں بٹ جائے اور اس کے ایک گروہ کی طاقت دوسرے گروہ کے خلاف استعمال ہونے لگے۔

موجودہ زمانہ میں بگاڑ کی یہ علامت مسلمانوں میں پوری طرح نمایاں ہو چکی ہے۔ آج ان میں ایسے مذہبی مسائل اور سیاسی نظریات فروغ پا رہے ہیں جو انھیں باہم حریف بنا کر ایک کو دوسرے سے ٹکرا دیں۔ ان میں ایسے لیڈر اٹھ رہے ہیں جو خود اپنے ملک کو فتح کر کے اس کے اوپر اپنی کامرانی کا جھنڈا لہرائیں۔ ان میں ایسے بہادر ابھر رہے ہیں جو خود اپنی قوم کے اداروں پر دھاوا بول کر ان پر قبضہ کر لیں اور ان کے اموال کو اپنے لئے غنیمت بنا لیں۔ ان میں ایسے مفکرین اور مدبرین پیدا ہو رہے ہیں جو اپنی قوم کے کچھ لوگوں کو "برائی کی علامت" قرار دے کر ان کے خلاف محاذ آرائی کریں اور ان کے قتل و غارت کا منصوبہ بنائیں۔ ان میں ایسی جماعتیں وجود میں آ رہی ہیں جو خود اپنی قوم کی دوسری جماعتوں کی بیخ کنی کو نشانہ بنا کر کام کریں۔ غرض پوری قوم بے شمار گروہوں میں بٹ گئی ہے۔ ہر شخص جس کے پاس کچھ طاقت ہے وہ اپنے بھائی کو اس کا مزہ چکھانے کے لئے بے قرار نظر آتا ہے۔

آج پوری امت، فرد سے لے کر گروہ تک، باہمی تصادم میں مشغول ہے۔ ملت کے افراد کا حال یہ ہے کہ وہ دوسری قوم کے آدمی کو برداشت کر سکتے ہیں مگر اپنی قوم کے آدمی کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں۔ دوسری اقوام کے خلاف کارروائی کرنے کے لئے ہر ایک بزدل ہے، مگر اپنی قوم سے لڑنے کے لئے ہر ایک بہادر بنا ہوا ہے۔ امت مسلمہ کی طاقت جو اغیار کے استیصال کے لئے تھی وہ خود ساختہ الفاظ بول کر خود اپنی قوم کے لوگوں کے خلاف استعمال ہو رہی ہے۔ یہ بلاشبہ خدا کے غضب کی علامت ہے، خواہ ہم بطور خود اس کو خدا کی رحمت قرار دے کر خوش ہو رہے ہوں۔

سُوْرَةُ يُوْنُسَ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ مِائَةٌ تِسْعُ اٰيَاتٍ وَّاَحَدَ عَشَرَ رُكُوْعًا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۝١ اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ۝٢

آیاتہا ۱۰۹ سورہ یونس مکیہ رکوعاتہا ۱۱

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

الف لام ر، یہ پُرحکمت کتاب کی آیتیں ہیں۔ کیا لوگوں کو اس پر حیرت ہے کہ ہم نے انھیں میں سے ایک شخص پر وحی کی کہ لوگوں کو ڈراؤ اور جو ایمان لائیں ان کو خوش خبری سنا دو کہ ان کے لئے ان کے رب کے پاس سچا مرتبہ ہے۔ منکروں نے کہا کہ یہ شخص تو کھلا جادوگر ہے ۲-۱

پیغمبر کا کلام انتہائی محکم دلائل پر مبنی ہوتا ہے۔ وہ اپنے غیر معمولی انداز کی بنا پر خود اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے بول رہا ہے۔ اس کے باوجود ہر زمانہ میں لوگوں نے پیغمبر کا انکار کیا۔ اس کی وجہ انسان کی ظاہر پرستی ہے۔ پیغمبر اپنے معاصرین کی نظر میں عام انسانوں کی طرح بس ایک انسان ہوتا ہے۔ اس کے گرد ابھی عظمت کی وہ تاریخ جمع نہیں ہوتی جو بعد کے زمانہ میں اس کے نام کے ساتھ وابستہ ہو جاتی ہے۔ اس لئے پیغمبر کے زمانہ کے لوگ پیغمبر کو محض ایک انسان سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ وہ پیغمبر کو نہ خدا کے بھیجے ہوئے کی حیثیت میں دیکھ پاتے اور نہ مستقبل میں بننے والی تاریخ کے اعتبار سے اس کا اندازہ کر پاتے، جب کہ ہر آدمی اس کی پیغمبرانہ عظمت کو ماننے پر مجبور ہوگا۔

پیغمبر کا کلام سراپا اعجاز ہوتا ہے جو سننے والوں کو بے دلیل کر دیتا ہے۔ مگر منکرین اس کی اہمیت کو گھٹانے کے لئے یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ ادبی ساحری ہے۔ وہ دلیل کے میدان میں اپنے آپ کو عاجز پا کر اس کے اوپر عیب لگانے لگتے ہیں۔ اس طرح وہ پیغمبر کے کلام کی صداقت کو مشتبہ کرتے ہیں۔ پیغمبر کا کلام جن لوگوں کو مفتوح کر رہا تھا ان کے بارے میں یہ تاثر دیتے ہیں کہ وہ محض سادگی میں پڑے ہوئے ہیں، ورنہ یہ سارا معاملہ الفاظ کے فریب کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ زبان کی جادوگری ہے نہ کہ کوئی واقعی اہمیت کی چیز۔

پیغمبر کا اصل مشن انذار و تبشیر ہے۔ یعنی خدا کی پکڑ سے ڈرانا اور جو لوگ خدا سے ڈر کر دنیا میں رہنے کے لئے تیار ہوں ان کو جنت کی خوش خبری دینا۔ پیغمبر اس لئے آتا ہے کہ لوگوں کو اس حقیقت واقعہ سے آگاہ کر دے کہ آدمی اس دنیا میں آزاد اور خود مختار نہیں ہے اور نہ زندگی کا قصہ آدمی کی موت

کے ساتھ ختم ہو جانے والا ہے۔ بلکہ موت کے بعد ابدی زندگی ہے اور آدمی کو سب سے زیادہ اسی کی فکر کرنا چاہیے۔ جو شخص غفلت برتے گا یا سرکشی کرے گا وہ موت کے بعد کی دنیا میں اس حال میں پہنچے گا کہ وہاں اس کے لئے دکھ کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔

ظاہر پرست انسان ہمیشہ یہ سمجھتا رہا ہے کہ عزت اور ترقی اس شخص کے لئے ہے جس کے پاس دنیا کا اقتدار ہے، جو دنیا کی دولت کا مالک ہے۔ پیغمبر بتاتا ہے کہ یہ سراسر دھوکا ہے۔ یہ عزت و ترقی تو وہ ہے جو موجودہ عارضی زندگی میں انسانوں کے درمیان ملتی ہے۔ مگر عزت اور ترقی دراصل وہ ہے جو مستقل زندگی میں خدا کے یہاں حاصل ہو۔ وہی عزت و ترقی حقیقی ہے اور اسی کے ساتھ دائمی بھی۔

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ ۖ مَا مِن شَفِيعٍ إِلَّا مِن بَعْدِ إِذْنِهِ ۚ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۚ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿٣﴾ إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا ۖ وَعْدَ اللَّهِ حَقًّا ۚ إِنَّهُ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ بِالْقِسْطِ ۚ وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيمٍ وَعَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿٤﴾

بے شک تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں (ادوار) میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر قائم ہوا۔ وہی معاملات کا انتظام کرتا ہے۔ اس کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش کرنے والا نہیں۔ یہی اللہ تمہارا رب ہے پس تم اسی کی عبادت کرو، کیا تم سوچتے نہیں۔ اسی کی طرف تم سب کو لوٹ کر جانا ہے، یہ اللہ کا پکا وعدہ ہے۔ بے شک وہ پیدائش کی ابتدا کرتا ہے، پھر وہ دوبارہ پیدا کرے گا تاکہ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے ان کو انصاف کے ساتھ بدلہ دے۔ اور جنھوں نے انکار کیا ان کے انکار کے بدلے ان کے لئے کھولتا پانی اور دردناک عذاب ہے ۴-۳

کائنات میں مختلف قسم کی چیزیں ہیں۔ علمی مطالعہ بتاتا ہے کہ ان چیزوں کا ظہور بیک وقت نہیں ہوا بلکہ تدریج کے ساتھ ایک کے بعد ایک ہوا ہے۔ قرآن اس تدریجی تخلیق کو چھ ادوار (Periods) میں تقسیم کرتا ہے۔ یہ دوری تخلیق ثابت کرتی ہے کہ کائنات کی پیدائش شعوری منصوبہ کے تحت ہوئی ہے۔ پھر کائنات کا مطالعہ یہ بھی بتاتا ہے کہ اس کا نظام حد درجہ محکم قوانین کے تحت چل رہا ہے۔ ہر چیز ٹھیک اسی طرح عمل کرتی ہے جس طرح مجموعی تقاضے کے تحت اسے عمل کرنا چاہیے۔ یہ واقعہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اس کارخانہ کائنات کا ایک زندہ مدبر ہے جو ہر لمحہ اس کا انتظام کر رہا ہے۔

کائنات کا یہ حیران کن نظام خود ہی پکار رہا ہے کہ اس کا مالک اتنا کامل اور اتنا عظیم ہے جس کے یہاں کسی سفارشی کی سفارش چلنے کا کوئی سوال نہیں۔ کائنات اپنی خصوصیات کے آئینہ میں اپنے خالق کی خصوصیات کو بتا رہی ہے۔

ساری کائنات میں "قسط" کا نظام قائم ہے۔ یہاں ہر ایک کے ساتھ یہ ہو رہا ہے کہ جو کچھ وہ کرتا ہے اسی کے مطابق نتیجہ اس کے سامنے آتا ہے۔ ہر ایک کو وہی ملتا ہے جو اس نے کیا تھا اور ہر ایک سے وہ چھن جاتا ہے جس کے لئے اس نے نہیں کیا تھا۔ زمین کا جو حصہ رات کے اسباب جمع کرے وہاں تاریکی پھیل کر رہتی ہے اور زمین کا جو حصہ روشنی کے اسباب پیدا کرے اس کے اوپر روشن سورج چمک کر رہتا ہے۔

یہ مادی نتائج کا حال ہے۔ مگر اخلاقی نتائج کے معاملہ میں دنیا کی تصویر بالکل مختلف نظر آتی ہے۔ انسان نیکی کرتا ہے اور اس کو نیکی کا پھل نہیں ملتا۔ انسان سرکشی کرتا ہے مگر اس کی سرکشی اپنا نتیجہ دکھائے بغیر جاری رہتی ہے۔ خالق کی جو مرضی اس کی دوسری مخلوقات میں چل رہی ہے اس کی وہی مرضی انسان کے معاملات میں کیوں ظاہر نہیں ہوتی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ انسان کی زندگی میں خدائی انصاف کے ظہور کو خدا نے بعد کو آنے والی دنیا کے لئے مؤخر کر دیا ہے۔ پہلی زندگی انسان کو عمل کے لئے دی گئی ہے، دوسری زندگی اس کو اپنے عمل کا نتیجہ پانے کے لئے دی جائے گی۔ اور دوسری زندگی کا ظہور یقیناً اتنا ہی ممکن ہے جتنا پہلی زندگی کا ظہور۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۝ اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ ۝

اللہ ہی ہے جس نے سورج کو چمکتا بنایا اور چاند کو روشنی دی اور اس کی منزلیں مقرر کر دیں تاکہ تم برسوں کا شمار اور حساب معلوم کرو۔ اللہ نے یہ سب کچھ بے مقصد نہیں بنایا ہے۔ وہ نشانیاں کھول کر بیان کرتا ہے ان کے لئے جو سمجھ رکھتے ہیں۔ یقیناً رات اور دن کے الٹ پھیر میں اور اللہ نے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں پیدا کیا ہے ان میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو ڈرتے ہیں ۶-۵

سورج ہماری زمین سے نہایت درست فاصلہ پر قائم ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ ہمارے لئے روشنی اور حرارت جیسی نعمتوں کا خزانہ بنا ہوا ہے۔ اگر اس اندازہ میں فرق ہو جائے تو سورج ہمارے لئے سورج نہ رہے

بلکہ آگ کا جہنم بن جائے، وہ زندگی کے بجائے موت کا پیغام ثابت ہو۔ چاند ایک حد درجہ ریاضیاتی حساب کے مطابق اپنے مدار پر ٹھیک ٹھیک گردش کرتا ہے۔ اسی بنا پر یہ ممکن ہوتا ہے کہ چاند بذات خود بے نور ہونے کے باوجود ہمارے لئے نہ صرف ٹھنڈی روشنی دے بلکہ مہینہ اور سال کی قدرتی تقویم بھی فراہم کرے۔ یہ فلکیاتی نشانیاں ثابت کرتی ہیں کہ اس کائنات میں گہری مقصدیت ہے، اور مقصدیت والی کائنات کا آخری انجام بے مقصد نہیں ہوسکتا۔

پھر ہماری دنیا میں رات کے بعد دن کا آنا مادی تمثیل کی زبان میں اس اخلاقی حقیقت کو بتا رہا ہے کہ موجودہ دنیا میں یہ قانون نافذ ہے کہ تاریکی کے بعد روشنی پھیلے، اندھیرے کے بعد اجالے کا ظہور ہو۔ یہاں حقوق کی پامالی کے بعد حقوق کی ادائگی کا نظام آنے والا ہے۔ انسان کی سرکشی کی جگہ خدائی انصاف کو غلبہ ملنے والا ہے۔ یہاں اس وقت کا آنا مقدر ہے جب کہ دھاندلی ختم ہو اور حق کے اعتراف کا ماحول چاروں طرف قائم ہوجائے۔

آخرت کی حقیقتوں کو خدا نے نشانیوں کے انداز میں ظاہر کیا ہے۔ بالفاظ دیگر، خدا موجودہ دنیا میں دلیل کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے نہ کہ محسوس مشاہدہ کے روپ میں۔ پھر خدا جس روپ میں اپنا جلوہ دکھاتا ہے اسی روپ میں ہم اس کو پاسکتے ہیں نہ کہ کسی اور روپ میں۔

خدا نے اس دنیا میں ہدایت کے راستے کھول رکھے ہیں مگر یہ ہدایت انھیں کا مقدر ہے جو خدائی نقشہ کے مطابق اس کی پیروی کرنے کے لئے تیار ہوں۔ یہاں وہی لوگ صحیح راستہ پر چلنے کی توفیق پائیں گے جو دلیل کی زبان میں بات کو سمجھنے اور ماننے کے لئے تیار ہوں۔ جو لوگ سچی دلیل کے آگے نہ جھکیں وہ گویا خدا کے آگے نہیں جھکے۔ انھوں نے خدا کو نہیں مانا۔ ایسے لوگوں کو اپنے لئے جہنم کے سوا کسی اور چیز کا انتظار نہ کرنا چاہئے۔

زمین و آسمان میں اگرچہ بے شمار نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں مگر وہ انھیں لوگوں کے لئے سبق بنتی ہیں جو ڈر رکھنے والے ہیں۔ ڈر یا اندیشہ وہ چیز ہے جو آدمی کو سنجیدہ بناتا ہے۔ جب تک آدمی کسی معاملہ میں سنجیدہ نہ ہو وہ اس معاملہ پر پورا دھیان نہیں دے گا اور نہ اس کے پہلوؤں کو سمجھے گا ——

پوری کائنات ایک زبردست تخلیقی توازن میں جکڑی ہوئی ہے۔ یہ اس بات کا کھلا ہوا اشارہ ہے کہ کائنات کا مالک ایسا مالک ہے جو انسان کو پکڑنے کی طاقت رکھتا ہے۔ اسی طرح پہلی زندگی جس کا ہم تجربہ کر رہے ہیں وہ اس کا یقینی ثبوت ہے کہ دوسری زندگی بھی ممکن ہے۔ موجودہ دنیا میں مادی نتائج کا نکلنا مگر اخلاقی نتائج کا نہ نکلنا تقاضا کرتا ہے کہ ایک اور دنیا بنے جہاں اخلاقی نتائج اپنی پوری صورت میں ظاہر ہوں۔ یہ سب انتہائی محکم باتیں ہیں مگر ان کا محکم ہونا وہی شخص جانے گا جو اندیشہ کی نفسیات کے تحت زندگی کے معاملہ کو دیکھتا ہو۔

إِنَّ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا وَرَضُوا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنُّوا بِهَا وَ
الَّذِينَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُونَ ﴿۷﴾ أُولٰٓئِكَ مَأْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿۸﴾
إِنَّ الَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيهِمْ رَبُّهُمْ بِإِيمَانِهِمْ ۚ تَجْرِي
مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهٰرُ فِي جَنّٰتِ النَّعِيمِ ﴿۹﴾ دَعْوٰىهُمْ فِيهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَ
تَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ ﴿۱۰﴾

بے شک جو لوگ ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے اور دنیا کی زندگی پر راضی اور مطمئن ہیں اور جو ہماری نشانیوں سے بے پروا ہیں، ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا بہ سبب اس کے جو وہ کرتے تھے۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے، اللہ ان کے ایمان کی بدولت ان کو پہنچا دے گا۔ ان کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی نعمت کے باغوں میں۔ اس میں ان کا قول ہوگا کہ اے اللہ تو پاک ہے۔ اور ملاقات ان کی سلام ہوگی۔ اور ان کی آخری بات یہ ہوگی کہ ساری تعریف اللہ کے لئے ہے جو رب ہے سارے جہان کا ۱۰-۷

جہنم کس کے لئے ہے ——— ان لوگوں کے لئے جو اس دن کو بھولے ہوئے ہوں جب کہ خدا سے ان کا سامنا ہوگا۔ جو آخرت کی ابدی نعمتوں کے مقابلہ میں دنیا کی عارضی چیزوں پر راضی ہو گئے ہوں۔ جن کا یہ حال ہو کہ دنیا میں انھیں جو کچھ امتحان کے طور پر ملا ہے اسی پر وہ مطمئن ہو جائیں۔ جو غیر خدائی چیزوں میں اپنا دل لگالیں کہ خدا کی طرف سے ظاہر کی جانے والی حقیقتوں سے غافل ہو جائیں۔ یہ سب خدا کے نزدیک جہنمی راستوں میں چلنا ہے، اور جو لوگ جہنمی راستوں میں چل رہے ہوں وہ آخر کار جہنم کے سوا اور کہاں پہنچیں گے۔

"اللہ انھیں ان کے ایمان کی وجہ سے جنت کی منزل تک پہنچائے گا" اس سے معلوم ہوا کہ ایمان آدمی کے لئے رہنمائی ہے۔ وہ آدمی کو غلط راہوں سے بچا کر صحیح راستہ پر چلاتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اس کو حقیقی منزل تک پہنچا دیتا ہے۔

ایمان خدا کی دریافت ہے۔ جس آدمی کو ایمان حاصل ہو جائے اس کو علم کا سرا ہاتھ آجاتا ہے، وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ ہر معاملہ میں صحیح مقام سے اپنی سوچ کا آغاز کر سکے۔ وہ فکری بے راہ روی سے بچ کر فکری صحت کا مالک بن جائے۔ مزید یہ کہ خدا کو ماننا کسی کتابی فلسفہ کو ماننا نہیں ہے۔ یہ ایک زندہ خدا کو ماننا ہے جو بالآخر تمام انسانوں کو اپنے یہاں جمع کرکے ان کا حساب لینے والا ہے۔ اس طرح ایمان آدمی کے اندر اپنے انجام کے بارے میں اندیشہ کی کیفیت پیدا کرکے اس کو انتہائی سنجیدہ انسان بنا دیتا ہے۔ وہ اپنے کو مجبور پاتا ہے کہ

اپنی تمام کارروائیوں کو صحیح اور غلط کی روشنی میں دیکھے اور صرف صحیح رخ پر چلے اور غلط رخ پر چلنے سے ہمیشہ پرہیز کرے۔

اس طرح ایمان آدمی کو صحیح فکر بھی دیتا ہے اور اسی کے ساتھ وہ قوت تمیز بھی جو اس کے لئے مستقل عملی رہنما بن جائے۔

آخرت کی جنت ان لوگوں کے لئے ہے جنھوں نے دنیا میں اپنے آپ کو اس کا مستحق ثابت کیا ہو۔ آخرت خدا کے براہ راست جلووں میں سرشار ہونے کا مقام ہے، وہاں بسنے کا موقع صرف ان لوگوں کو ملے گا جو دنیا میں خدا کے بالواسطہ جلووں سے سرشار ہوئے تھے۔ آخرت میں لوگوں کے دل ایک دوسرے کے لئے سلامتی اور خیر خواہی کے جذبات سے بھرے ہوئے ہوں گے، اس لئے وہاں کی آبادی میں وہی لوگ جگہ پائیں گے جنھوں نے دنیا میں اس بات کا ثبوت دیا تھا کہ دوسروں کے لئے ان کے دل میں سلامتی اور خیر خواہی کے سوا کوئی دوسرا جذبہ نہیں۔

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ ؕ فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖۤ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَاۤ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲﴾

اگر اللہ لوگوں کے لئے عذاب اسی طرح جلد پہنچا دے جس طرح وہ ان کے ساتھ رحمت میں جلدی کرتا ہے تو ان کی مدت ختم کر دی گئی ہوتی۔ لیکن ہم ان لوگوں کو جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے ان کی سرکشی میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ اور انسان کو جب کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہم کو پکارتا ہے۔ پھر جب ہم اس سے اس کی تکلیف کو دور کر دیتے ہیں تو وہ ایسا ہو جاتا ہے گویا اس نے کبھی اپنے کسی برے وقت پر ہم کو پکارا ہی نہ تھا۔ اس طرح حد سے گزر جانے والوں کے لئے ان کے اعمال خوش نما بنا دئے گئے ہیں

۱۲ — ۱۱

خدا کا قانون یہ ہے کہ کوئی شخص قابل انعام عمل کرے تو اس کا عمل فوراً اس کے اعمال نامہ میں شامل کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص قابل سزا فعل کا ارتکاب کرتا ہے تو خدا اس کو ڈھیل دیتا ہے تاکہ وہ کسی نہ کسی موڑ پر متنبہ ہو کر اپنی اصلاح کر لے۔ خدا کا یہ قانون انسان کے لئے بہت بڑی رحمت ہے، ورنہ انسان اتنا ظالم ہے کہ وہ ہر وقت برائی کرنے پر آمادہ رہتا ہے، اور اگر لوگوں کو ان کی برائیوں پر فوراً پکڑا جانے

لگے تو ان کی مہلت عمر بہت جلد ختم ہو جائے اور زمین کی پشت چلنے والے انسانوں سے خالی ہو جائے۔

دنیا کی زندگی میں سرکش وہ لوگ بنتے ہیں جو دنیا میں یہ سمجھ کر رہیں کہ مرنے کے بعد انھیں خدا کا سامنا نہیں کرنا ہوگا۔ جو پکڑ کے اندیشہ سے خالی ہو کر زندگی گزارتے ہیں۔ جو سمجھتے ہیں کہ وہ آزاد ہیں کہ جو دھاندلی چاہیں کریں اور جو فساد چاہیں پھیلائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان سچائی اور انصاف کے ساتھ معاملہ کرنے کا ایک ہی حقیقی محرک ہے۔ اور وہ یہ کہ آدمی یہ سمجھے کہ سب طاقت وروں کے اوپر ایک طاقت ور ہے۔ ہر آدمی اس کے آگے بے بس ہے۔ وہ ایک دن تمام انسانوں کو پکڑے گا اور ہر ایک مجبور ہوگا کہ اپنے بارے میں اس کے فیصلہ کو تسلیم کرے۔

دنیا کا نظام اس طرح بنا ہے کہ آدمی بار بار کسی نہ کسی تکلیف یا حادثہ کی زد میں آجاتا ہے، آدمی محسوس کرنے لگتا ہے کہ خارجی طاقتوں کے مقابلہ میں وہ بالکل بے بس ہے۔ اس وقت آدمی بے اختیار ہو کر خدا کو پکارنے لگتا ہے۔ وہ خدا کی قدرت کے مقابلہ میں اپنے عجز کا اعتراف کر لیتا ہے۔ مگر یہ حالت صرف اس وقت تک رہتی ہے جب تک وہ مصیبتوں کی گرفت میں ہو، مصیبت سے نجات پاتے ہی وہ دوبارہ ویسا ہی غافل اور سرکش بن جاتا ہے جیسا وہ پہلے تھا۔ ایسے لوگوں کے اظہار بندگی کو خدا تسلیم نہیں کرتا۔ کیونکہ اظہار بندگی وہ مطلوب ہے جو آزادانہ حالات میں کی جائے، مجبورانہ حالات میں ظاہر کی ہوئی بندگی کی خدا کے نزدیک کوئی قیمت نہیں۔

آدمی ایک توجیہہ پسند مخلوق ہے۔ وہ ہر عمل کا ایک جواز تلاش کرتا ہے۔ اگر آدمی سرکشی کو اپنے لئے پسند کرلے تو اس کا ذہن بھی اسی طرف مڑ جائے گا۔ وہ عملاً سرکشی کرے گا اور اس کا ذہن اس کی سرکشی کو درست ثابت کرنے کے لئے اس کو خوبصورت الفاظ فراہم کرتا رہے گا۔ اسی کا نام تزئین اعمال ہے۔ آدمی اپنی غلطیوں کو خوش نما الفاظ میں بیان کر کے اپنے کو مطمئن کر لیتا ہے کہ وہ حق پر ہے۔ مگر یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص آگ کا انگارہ اپنے ہاتھ میں لے لے اور سمجھے کہ وہ اس کو نہیں جلائے گا کیونکہ اس کا نام اس نے سرخ پھول رکھ دیا ہے۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا ۙ وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰۗىِٕفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝

اور ہم نے تم سے پہلے قوموں کو ہلاک کیا جب کہ انھوں نے ظلم کیا۔ اور ان کے پیغمبر ان کے پاس کھلی دلیلوں کے ساتھ آئے اور وہ ایمان لانے والے نہ بنے۔ ہم ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں مجرم لوگوں کو۔ پھر ہم نے ان کے بعد تم کو ملک میں جانشین بنایا تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسا عمل کرتے ہو ۱۳-۱۴

"پیغمبر اپنی قوموں کے پاس بینات کے ساتھ آئے مگر انھوں نے نہ مانا"۔ بینہ جمع بینات کے معنی دلیل کے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کا داعی ہمیشہ بینات کی بنیاد پر اٹھتا ہے۔ لوگوں کو اسے دلائل کی سطح پر پہچاننا پڑتا ہے۔ جو لوگ ظاہری عظمتوں اور عوامی استقبالیوں میں خدا کے داعی کو پانا چاہیں وہ کبھی اس کو نہیں پائیں گے، کیونکہ خدا کا داعی وہاں موجود ہی نہیں ہوتا۔ نبی معجزہ دکھاتا ہے۔ مگر معجزہ آخری مرحلہ میں اتمام حجت کے لئے آتا ہے، دعوتی مرحلہ میں سارا کام دلائل کی بنیاد پر ہوتا ہے۔

کسی شخص یا گروہ کا ظالم ہونا یہ ہے کہ وہ دلیل کے روپ میں ظاہر ہونے والی دعوت خداوندی کو نہ پہچانیں اور اپنے خود ساختہ معیار پر نہ پانے کی وجہ سے اس کا انکار کر دیں۔ ایسے لوگ اپنی اس روش کی وجہ سے خدائی قانون کی زد میں آجاتے ہیں۔

ماضی کی جن قوموں پر انکار نبوت کے جرم میں خدا کا عذاب نازل ہوا وہ سرے سے نبوت کی منکر نہ تھیں۔ یہ تمام قومیں کسی نہ کسی سابق پیغمبر کو مانتی تھیں۔ البتہ انھوں نے وقت کے پیغمبر کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ پچھلے پیغمبر کا معاملہ یہ تھا کہ اس کی پشت پر تاریخ کی تصدیقات قائم ہو گئی تھیں اور قومی عصبیتیں اس کے ساتھ وابستہ ہو چکی تھیں۔ جب کہ معاصر پیغمبر ابھی اس قسم کی اضافی خصوصیات سے خالی تھا۔ انھوں نے اس گزرے ہوئے پیغمبر کا اقرار کیا جو نسلوں کی روایات کے نتیجہ میں ان کا قومی پیغمبر بن چکا تھا، جس کے ساتھ اپنے کو منسوب کرنا تاریخی عظمت کے مینار سے اپنے کو منسوب کرنے کے ہم معنی تھا۔ انھوں نے اپنے قومی پیغمبر کو پیغمبر مانا مگر اس پیغمبر کا انکار کر دیا جس کو صرف دلیل اور برہان کے ذریعہ جانا جا سکتا تھا۔

یہ جرم خدا کی نظر میں اتنا شدید تھا کہ وہ لوگ نبی کے منکر قرار دے کر ہلاک کر دئے گئے۔

"پھر ہم نے اس کے بعد تم کو ملک میں خلیفہ بنایا"۔ خلیفہ کے اصل معنی ہیں بعد کو آنے والا۔ یہ لفظ جانشین، خاص طور پر، اقتدار میں جانشین کے لئے بولا جاتا ہے۔ یہ جانشینی انسان کی ہوتی ہے نہ کہ خدا کی۔ کوئی انسان اقتدار میں خدا کا جانشین نہیں ہو سکتا۔ انسان ہمیشہ کسی مخلوق کا جانشین ہوتا ہے۔ قرآن میں جہاں بھی خلافت کا لفظ آیا ہے وہ مخلوق کی جانشینی کے لئے ہے نہ کہ خدا کی جانشینی کے لئے۔

کسی کو خلیفہ (جانشین) بنانا اعزاز کے لئے نہیں بلکہ صرف امتحان کے لئے ہوتا ہے۔ جانشین بنانے کا مطلب ایک کے بعد دوسرے کو کام کا موقع دینا ہے، ایک قوم کے بعد دوسری قوم کو امتحان کے میدان میں کھڑا کرنا ہے۔ جیسے ہندستان میں دیسی راجاؤں کی جگہ مغلوں کو اختیار دیا گیا۔ پھر ان کو ہٹا کر انگریز ان کے جانشین بنائے گئے۔ اس کے بعد انھیں ملک سے نکال کر اکثریتی فرقہ کے لئے جگہ خالی کی گئی۔ ان میں سے ہر بعد کو آنے والا اپنے پہلے کا خلیفہ تھا۔

ہمارے علمار

مولانا عبید اللہ سندھی (۱۹۴۴ — ۱۸۷۲) نے ہندستان کی آزادی کی تحریک کے زمانہ میں یورپ کا سفر کیا تھا۔ وہ یورپ کے سفر سے واپس آئے تو انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ علمار اپنا موجودہ کرتا اور پائجامہ اتار دیں اور ہیٹ اور پتلون پہنیں۔ اس سے ان کا جمود ٹوٹے گا اور ان کے اندر جدید حالات کے لحاظ سے سوچنے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔ علمار یہ تجویز سن کر بگڑ گئے۔ کسی نے مولانا عبید اللہ سندھی کو کافر قرار دیا، کسی نے کہا کہ وہ پاگل ہو گئے ہیں۔

ہمارے علمار کبھی اس کے لئے تیار نہیں ہو سکتے کہ وہ ہیٹ اور کوٹ پینٹ پہن کر سڑکوں پر چلیں، حالانکہ یہ زیادہ سے زیادہ لغو ہے نہ کہ حرام دوسری طرف یہی علمار جان بوجھ کر ایسے کام کرتے ہیں جو شریعت میں صراحۃً حرام قرار دیے گئے ہیں ——— وہ اسلامی اتحاد کو توڑتے ہیں، وہ ایک دوسرے کے خلاف تخریب کاری کے منصوبے بناتے ہیں۔ ان کا ایک گروہ دوسرے گروہ پر غبن، خیانت، کذب بیانی اور عہد شکنی کے الزامات لگاتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کی پوشیدہ باتوں کا پتہ لگا کر عوام میں ان کو شہرت دیتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان کے اوپر تنقید کر دے تو اس کے خلاف ان کے انتقام کی آگ برسوں تک نہیں بجھتی۔

یہ سارے کام بلاشبہ خدا کی شریعت میں حرام ہیں۔ مگر ہمارے علمار پوری دلیری کے ساتھ ان کا ارتکاب کرتے ہیں، وہ اس مقصد کے لئے جلسے کرتے ہیں، لاکھوں روپے خرچ کر کے اخبار نکالتے ہیں جو ان کی ان خرافات کی اشاعت کرے، وہ اپنے لوگوں کو ملا کر جتھے بناتے ہیں اور پھر ایک جتھا دوسرے جتھے کو گرانے اور ذلیل کرنے کے لئے وہ تمام کارروائیاں کرتا ہے جو اس کے لئے ممکن ہیں۔

یہ صورت حال ثابت کر رہی ہے کہ ہمارے علمار کے یہاں اب صرف نمائش والا دین باقی رہ گیا ہے، حقیقت والا دین ان کے یہاں موجود نہیں۔ عوام میں اپنا دینی وقار قائم رکھنے کے لئے عرفی طور پر جن چیزوں کی اہمیت ہے ان پر وہ سختی سے قائم ہیں اور جو چیزیں خدا کے یہاں ان کو روسیاہ کرنے والی ہیں ان کی انھیں کوئی فکر نہیں۔ ان کو عوام کا ڈر ہے۔ مگر خدا کا ان کے دل میں کوئی ڈر نہیں۔

عوام چندے دیتے ہیں، عوام استقبال کرتے ہیں، عوام حلقہ فراہم کرتے ہیں۔ عوام کے بل پر قیادت و پیشوائی حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگ سب سے زیادہ اہمیت اس بات کو دیتے ہیں کہ عوام کے درمیان ان کا دینی بھرم قائم رہے۔ ان کو دنیا کی ضرورت تھی جو عوام کے ذریعہ انھیں مل گئی۔ پھر خدا کی جنت اور جہنم کے لئے فکرمند ہونے کی انھیں کیا ضرورت۔

استہزار اور گریز

آدمی کے سامنے جب ایک ایسی سچائی آتی ہے جس کا توڑ وہ دلائل کی زبان میں نہ کر سکتا ہو تو اکثر وہ دو چیزوں کا سہارا لیتا ہے ــــ استہزار اور گریز۔ استہزار کا مقصد داعی کے بارے میں یہ تاثر دینا ہے کہ وہ اتنا حقیر شخص ہے کہ اس کی بات قابل اعتنا ہی نہیں۔ اسی طرح گریز کا طریقہ آدمی اس وقت اختیار کرتا ہے جب کہ اس کے پاس اصل بات کی براہ راست دلیل موجود نہ ہو۔ ایسے موقع پر وہ اِدھر اُدھر کی باتیں زور شور سے بول کر یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کے پاس جواب دینے کے لئے بہت کچھ ہے، دلیل کے میدان میں وہ خالی نہیں۔

پہلی چیز کی ایک مثال قرآن کی سورہ نمبر ۳۷ میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنی وہ دعوت پیش کی جو قرآن کے مطابق تمام پیغمبروں کی مشترک دعوت تھی تو قریش نے کہا "کیا ہم ایک شاعر دیوانہ کے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں" (الصافات ۳۶)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مضبوط دلائل کا قریش کے پاس کوئی جواب نہ تھا اس لئے انھوں نے آپ کو شاعر اور دیوانہ کہا تاکہ آپ کو ناچیز ظاہر کر کے آپ کی بات کو مذاق میں اڑا دیں۔

دوسری چیز کی مثال سورہ نمبر ۳ میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب اونٹ کا گوشت اور دودھ استعمال کرتے تھے۔ یہود نے ان چیزوں کو اپنی شریعت میں حرام کر رکھا تھا۔ چنانچہ یہود نے یہ کہنا شروع کیا کہ محمد اپنے کو ملت ابراہیمی کا حامل بتاتے ہیں حالاں کہ وہ ان چیزوں کو کھاتے ہیں جو ملت ابراہیمی میں حرام ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ ملت ابراہیمی پر ہم ہیں نہ کہ محمد اور ان کے ساتھی۔ قرآن میں کہا گیا کہ اگر تم سچے ہو تو اپنی مقدس کتاب تورات لاؤ اور دکھاؤ کہ اس کی کس آیت میں یہ بات لکھی ہوئی ہے (آل عمران ۹۳) اس کے جواب میں یہود نے تورات کی کوئی آیت پیش نہیں کی۔ البتہ وہ دوسری دوسری باتیں کہنے لگے۔ مثلاً یہ کہ یہ بات تو بالکل معلوم و مشہور ہے، پھر اس کے لئے تورات کی کوئی آیت پیش کرنے کی کیا ضرورت۔

انسان کا حال ہمیشہ یہی رہا ہے کہ جب وہ دلیل کے میدان میں اپنے کو خالی پاتا ہے تو وہ استہزار اور گریز کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ وہ آدمی کو ناقابل التفات ظاہر کرتا ہے یا غیر متعلق الفاظ بول کر یہ تاثر دیتا ہے کہ اس کے پاس کہنے کے لئے بہت کچھ موجود ہے۔ اس کی مثالیں پچھلے دور میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں اور آج کے دور میں بھی۔

فساد کا ذمہ دار

منتخب التواریخ علامہ عبدالقادر بدایونی کی مشہور کتاب ہے۔ موصوف شہنشاہ اکبر کے ہم عصر ہیں۔ اور اس کے دربار میں رہے ہیں۔ وہ اکبر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ ایک بادشاہ تھا جو حق کا طالب تھا اور اپنے اندر نفیس جوہر رکھتا تھا (بادشاہے کہ جوہر نفیس داشت و طالب حق) اکبر اپنی ابتدائی زندگی میں بڑا دیندار اور عبادت گزار تھا۔ اس نے سات عالم صرف نماز کی امامت کے لئے مقرر کر رکھے تھے جن میں ایک خود ملا عبدالقادر بدایونی تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ اکبر کے دربار میں پانچوں وقت جماعت کے ساتھ نماز ہوتی تھی جس میں بادشاہ خود شریک ہوتا تھا (ہر پنج وقت برائے خاطر جماعت در دربار می گفتند) اکبر جب سفر کے لئے نکلتا تو اس کے ساتھ ایک خاص خیمہ نماز کا ہوتا تھا جس میں بادشاہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتا تھا۔

شہنشاہ اکبر کے اس دیندارانہ مزاج کا یہ قدرتی نتیجہ ہوا کہ اس کے دربار میں علماء جمع ہونے لگے۔ اکبر کو حدیثیں سننے اور مسائل دین پر گفتگو کرنے سے خاص دلچسپی تھی۔ اس مقصد کے لئے وہ علماء کی صحبتوں میں دیر دیر تک بیٹھتا تھا، ملا بدایونی نے لکھا ہے کہ اکبر کے گرد جمع ہونے والے علماء کی تعداد ایک سو سے بھی اوپر تک پہنچ گئی تھی (جماعت مناظرین و مباحثین چہ محقق چہ مقلد از صد نفر متجاوز بودند) بادشاہ کے گرد جمع ہونے والے یہ علماء قدرتی طور پر بادشاہ کی عنایتوں میں حصہ پانے لگے۔ بس یہیں سے وہ حالات پیدا ہوئے جس نے ایک دیندار بادشاہ کو بے دین بنا ڈالا۔

ظاہر ہے کہ سو آدمی بیک وقت بادشاہ کے قریب نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ چنانچہ پہلا جھگڑا نشست گاہوں پر شروع ہوا۔ ہر ایک اس کوشش میں رہتا کہ وہ بادشاہ کے قریب بیٹھے۔ اب جس کو قریب جگہ نہ ملتی وہ جلن میں مبتلا ہوتا۔ اسی طرح بادشاہ کے انعامات میں جس کو کم حصہ ملتا وہ اس سے حسد کرنے لگتا جس کو اتفاق سے زیادہ انعام مل گیا ہو۔

علماء کا حال یہ ہوا کہ وہ ایک دوسرے کو گرانے کے لئے ایک دوسرے کی برائیاں کرنے لگے۔ ملا بدایونی کے الفاظ میں علماء کے گروہ سے بہت سی بیہودگی ظاہر ہوئی (بدنفسی ہا ازیں جماعت ظاہر شدند) ایک نے دوسرے کے خلاف زبان کی تلوار نکالی، ایک دوسرے کی نفی اور تردید میں لگ گیا۔ ان کا اختلاف یہاں تک بڑھا کہ ایک نے دوسرے کو کافر بنایا، ایک نے دوسرے کو گمراہ ثابت کیا (بایک دیگر تیغ زباں کشیدہ در مقام تنافی و تقابل بودند و اختلاف بجائے رسید کہ تکفیر و تضلیل ہمدگر می نمودند) نوبت یہاں تک پہنچی کہ شاہی دربار میں ان علماء کی گردنوں کی رگیں پھول آئیں، آوازیں بلند ہوئیں اور زبردست شور برپا ہوا

(رگ گردن علمار زماں برآمدہ آوازہائے بلند و دمدمہ بسیار ظاہر شد)

علمار کی ان نازیبا حرکتوں سے بادشاہ کا متاثر ہونا فطری تھا۔ اس کو سخت گراں گزرا (برخاطر اشرف گراں آمد) اس کے بعد بادشاہ نے پہلی کارروائی یہ کی کہ ملا بدایونی کو حکم دیا کہ اس قسم کے نامعقول عالموں کو آئندہ بادشاہ کی مجلس میں آنے نہ دیں۔ اس کے باوجود علمار کی حرکتیں بند نہ ہوئیں۔ ان کی باتیں بادشاہ کے لئے ایمانی قوت کے بجائے بدگمانی اور برگشتگی میں اضافہ کا سبب بنتی رہیں۔ علمار کا یہ حال تھا کہ ایک دوسرے کی ضد میں کوئی عالم ایک چیز کو حرام کہتا اور دوسرا اس کو حلال بتاتا۔ ان چیزوں نے بادشاہ کو شک میں ڈال دیا۔ اس کی حیرانی بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اصل مقصد ہی سامنے سے جاتا رہا (در شک انداختہ حیرت برحیرت افزود و مقصود از میاں رفت)

درباری علمار میں سے ایک ملا عبداللہ سلطان پوری تھے۔ ان کا سرکاری لقب مخدوم الملک تھا۔ انھوں نے مختلف طریقوں سے جو دولت جمع کی تھی اس کا حال ملا بدایونی نے ان الفاظ میں لکھا ہے " ان کا انتقال ہوا تو بادشاہ کے حکم سے ان کے مکان کا جائزہ لیا گیا جو لاہور میں تھا۔ اتنے خزانے اور دفینے ظاہر ہوئے کہ ان خزانوں کے تالوں کو دہم کی کنجیوں سے بھی کھولنا ممکن نہ تھا۔ حتیٰ کہ سونے سے بھرے ہوئے چند صندوق مخدوم الملک کے خاندانی قبرستان سے برآمد ہوئے جنھیں مُردوں کے بہانے سے زمین میں دفن کیا گیا تھا۔"

شاہ عبدالقدوس گنگوہی کے پوتے ملا عبدالنبی تھے جو اکبر کے زمانہ کے سب کے بڑے عالم سمجھے جاتے تھے۔ پورے ملک کے خطبار اور ائمہ کے درمیان جاگیر تقسیم کرنے کا انھیں اختیار تھا۔ شہنشاہ اکبر ان کا اتنا زیادہ احترام کرتا تھا کہ ان کی جوتیاں سیدھی کرتا تھا۔ مگر مذکورہ مخدوم الملک اور ملا عبدالنبی کے درمیان رقیبانہ کش مکش شروع ہوئی۔ ایک نے دوسرے کو جاہل اور گمراہ ثابت کرنے کے لئے رسالے لکھے۔ ایک نے دوسرے کی بابت لکھا کہ چونکہ انھیں بواسیر ہے اس لئے ان کے پیچھے نماز ناجائز ہے۔ دوسرے نے لکھا کہ تم اپنے باپ کے عاق کئے ہوئے بیٹے ہو اس لئے تمھارے پیچھے بھی نماز جائز نہیں۔ اس قسم کی لایعنی بحثوں سے شاہی کیمپ صبح و شام گونجتا رہتا تھا۔

شہنشاہ اکبر ابتداءً نہایت دین دار تھا اور دینی شخصیتوں سے بڑی عقیدت رکھتا تھا۔ مگر دین کے نمائندوں کی خرافات کو مسلسل دیکھنے کے بعد وہ دین سے بھی بیزار ہوگیا اور دینی شخصیتوں سے بھی۔ علمار کا یہ حال تھا کہ جانوروں کی طرح آپس میں لڑتے۔ ایک عالم ایک فعل کو حرام بتاتا اور دوسرا عالم اسی فعل کو حلال قرار دیتا۔

ملا بدایونی لکھتے ہیں:

علمار عہد خویش را بہتر از غزالی و رازی تصور نمودہ بودند۔ رکاکت ہائے ایشاں را دیدہ قیاس غائب برشاہد

اکبر اپنے زمانہ کے علمار کو غزالی اور رازی سے بہتر سمجھتا تھا۔ جب اس نے ان کی پست حرکتوں کو دیکھا تو حال

کردہ سلف را نیز منکر شدند — پر ماضی کو قیاس کر کے سب کا منکر ہو گیا۔

اس کے بعد اکبر کے دربار میں علماء کا وقار ختم ہو گیا۔ ابوالفضل اور فیضی جیسے لوگ دربار شاہی میں اہمیت اختیار کر گئے۔ اکبر کو علماء کی باتوں کی کوئی پرواہ نہیں رہی۔ ابوالفضل اکبر کے سامنے علماء کا مذاق اڑاتا اور اکبر اس کو سن کر خوش ہوتا۔ ملا بدایونی کے الفاظ میں: کسی بحث کے درمیان اگر ائمہ مجتہدین کی کوئی بات پیش کی جاتی تو ابوالفضل اس کو نظر انداز کرتے ہوئے کہتا کہ فلاں حلوائی، فلاں کفش دوز اور فلاں چرم ساز کے قول سے تم میرے اوپر حجت قائم کرنا چاہتے ہو۔

حسد اور کبر یہودی علماء کا عام مرض تھا۔ یہی ہمارے علماء کا بھی سب سے زیادہ عام مرض بن گیا ہے۔ صحابہ کرام بھی دین کے عالم تھے۔ مگر ان کے درمیان حسد اور کبر کا وجود نہ تھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ بعد کے زمانہ کے علماء کے اندر یہ اخلاقی برائی اس قدر عمومی طور پر پیدا ہو گئی۔ اس کی وجہ خود علم کا فرق ہے۔ صحابہ کرام کے زمانہ میں عالم ہونے کا مطلب کچھ اور تھا اور بعد کے زمانہ میں عالم ہونے کا مطلب کچھ اور۔ صحابہ کرام کا نصاب تعلیم صرف قرآن و حدیث تھا، اس کے برعکس بعد کے زمانہ میں دینی نصاب کے نام سے جو تعلیمی نصاب رائج ہوا اس میں قرآن و حدیث برائے نام رہ گئے اور اصل اہمیت دوسرے فنون نے لے لی۔ اس فرق کا نتیجہ لازماً ظاہر ہونا تھا، کیونکہ قرآن و حدیث کے علم سے آدمی کے اندر خشیت پیدا ہوتی ہے (فاطر ۲۸) اور فنی علوم سے احساس برتری (غافر ۸۳)

علم کے ساتھ عام طور پر بڑائی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سے مستثنیٰ صرف خدا کا علم ہے۔ خدا کا علم ایک ایسا علم ہے جس میں آدمی مالک کائنات کی عظمت اور اس کے مقابلہ میں اپنے عجز کو دریافت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدائی علم آدمی کے اندر خاکساری پیدا کرتا ہے۔ جبکہ دوسرے علوم آدمی کے اندر عجب اور گھمنڈ پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔

خدائی علم ابتدائی زمانہ میں صرف خدا کی کتاب اور رسول کی سنت پر مشتمل ہوتا ہے۔ مگر بعد کے زمانہ میں اس کو فنی بنانے کی کوشش شروع ہو جاتی ہے۔ فنی بنانے کی کوشش میں سادہ خدائی علم اس سطح پر پہنچ جاتا ہے جو عام دنیوی علوم کی سطح ہے۔ مشکل اصطلاحیں، پیچیدہ اسلوب، منطقی ترتیب، دور از کار بحثیں وغیرہ مل کر دینی علم کو ایسی شکل دے دیتے ہیں کہ وہ کہنے کے لئے بظاہر ایک دینی علم ہوتا ہے۔ مگر اپنے مجموعی تاثر کے اعتبار سے وہ ایک عام علم بن جاتا ہے۔ اس کو پڑھنے سے آدمی کے اندر نہ کوئی ربانی شعور جاگتا اور نہ اس کے دل میں خوف خدا کا کوئی قطرہ ٹپکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے علم کے ماہرین وہی کچھ کریں گے جس کی ایک تصویر اوپر کے واقعہ میں نظر آتی ہے۔

دیباچہ تذکیر القرآن

قرآن اگرچہ ایک اعلیٰ ترین علمی کتاب ہے، اس میں فطری حدود کے اندر علم و عقل کی پوری رعایت رکھی گئی ہے۔ مگر قرآن میں کسی بات کو ثابت کرنے کے لئے معروف علمی اور فنی انداز اختیار نہیں کیا گیا ہے۔ قرآن کا طریقہ یہ ہے کہ فنی آداب اور علمی تفصیلات کو چھوڑ کر اصل بات کو مؤثر دعوتی اسلوب میں بیان کیا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کا مقصد علمی مطالعہ پیش کرنا نہیں ہے، اس کا مقصد تذکیر و نصیحت ہے اور تذکیر و نصیحت کے لئے ہمیشہ سادہ اسلوب کارآمد ہوتا ہے نہ کہ فنی اسلوب۔

تاہم یہ ایک طالب علمانہ ضرورت ہے کہ قرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک آدمی قرآن کے بیانات کی علمی تفصیلات اور اس کے فنی پہلوؤں کو جاننا چاہے۔ ایسی حالت میں یہ سوال ہے کہ قرآن کی تفسیر کے لئے کیا انداز اختیار کیا جائے۔ قرآن کی تفسیر اگر اس کے اپنے سادہ دعوتی اسلوب میں کی جائے تو اس کا یہ فائدہ ہوگا کہ تفسیر میں نصیحت اور تذکیر کی فضا باقی رہے گی جو قرآن کا اصل مقصود ہے مگر ایسی صورت میں خالص علمی تقاضوں کی رعایت نہ ہو سکے گی۔ دوسری طرف اگر علمی و فنی پہلوؤں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مفصل تفسیر لکھی جائے تو بعض خاص طبیعتوں کو وہ پسند آسکتی ہے مگر عام لوگوں کے لئے وہ ایک مقدس دستاویز بن کر رہ جائے گی۔ مزید یہ کہ وہ قرآن کے اصل مقصد — تذکیر و نصیحت کو مجروح کرنے کی قیمت پر ہوگا۔

اس مسئلہ کا ایک سادہ حل یہ ہے کہ تفسیر اور معلومات کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا جائے۔ قرآن کے ساتھ جو تفسیر شائع کی جائے وہ خود تو نصیحت اور تذکیر کے انداز میں ہو۔ اس کے بعد اس سے الگ ایک مستقل کتاب قاموس القرآن یا قرآنی انسائیکلوپیڈیا کے طور پر مرتب کر کے شائع کی جائے۔ اس دوسری کتاب میں وہ تمام فنی بحثیں اور علمی اور تاریخی معلومات ہوں جو قرآنی حوالوں کو تفصیلی انداز میں سمجھنے کے لئے ضروری ہیں۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام سے متعلق آیات کے ذیل میں جو تفسیر لکھی جائے اس میں تو آنجناب کی زندگی کے صرف قابل عبرت پہلوؤں کی وضاحت ہو جن کی طرف قرآن میں اشارے کئے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ آپ کے بارے میں جو تاریخی اور اثریاتی معلومات ہیں ان کو قاموس القرآن میں جمع کر دیا جائے جن کو آدمی لفظ "ابراہیم" کے تحت دیکھ سکے۔ اسی طرح نحوی، فقہی، کلامی اور طبیعیاتی مسائل کی تفصیل بھی قرآن کی انسائیکلوپیڈیا میں درج ہوں نہ کہ قرآن کی تفسیر میں۔

تذکیر القرآن اسی نہج پر قرآن کی ایک خدمت ہے۔ تذکیر القرآن کو ہم نے اصل مطالب قرآن کی یاد دہانی تک محدود رکھا ہے۔ اور جہاں تک دیگر علمی وفنی معلومات کا تعلق ہے وہ انشاء اللہ علیحدہ کتاب کی صورت میں مرتب کرکے شائع کی جائیں گی۔

یہ انداز عین وہی ہے جو خود قرآن نے اختیار کیا ہے۔ قرآن میں طبیعیات اور فلکیات کے حوالے ہیں مگر ان کی تفصیلات کو خدا نے چھوڑ دیا کہ بعد کے زمانہ کے اہل علم انھیں دریافت کرکے ان کو مدون کریں۔ قرآن میں قدیم شخصیتوں کا ذکر ہے۔ مگر خدا نے یہ کام آئندہ آنے والے والے ماہرین اثریات کے لئے باقی رکھا کہ وہ ان کی تحقیق کریں اور ان کی تاریخی تفصیلات سے دنیا کو آگاہ کریں۔ خدا قرآن میں خود ان تمام واقعات کو شامل کرسکتا تھا۔ مگر وہ صرف اس قیمت پر ہوتا کہ قرآن میں عبرت اور نصیحت کی فضا ختم ہو جائے۔ چنانچہ خدا نے، ہر چیز سے باخبر ہونے کے باوجود، سارا زور صرف نصیحت کی باتوں پر دیا اور بقیہ تفصیلات کو دوسروں کے لئے چھوڑ دیا۔

قرآن میں ایک طرف معلومات کی نوعیت کی بے شمار تفصیلی باتوں کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ دوسری طرف بنیادی نصیحت والی باتوں کو بار بار دہرایا گیا ہے حتیٰ کہ بہت سے لوگوں کو یہ کہنے کا موقع مل گیا ہے کہ قرآن میں مضامین کی تکرار ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کا یہ مقصد نہیں کہ لوگ اس کو معلومات کی ایک کتاب سمجھ کر پڑھ لیں۔ قرآن خدا اور آخرت کی باتوں کو لوگوں کی روح کی غذا بنانا چاہتا ہے۔ کسی چیز کو آدمی معلوماتی طور پر پڑھے تو اس کی تکرار اس کو ناگوار ہوگی۔ مگر جو چیز آدمی کی زندگی میں روح کی غذا بن کر داخل ہو جائے اس کی ہر تکرار آدمی کو نئی لذت دیتی ہے۔ جہاں لذت ہو وہاں تکرار کا تصور ختم ہو جاتا ہے۔ قرآن میں یہ انداز اس لئے اختیار کیا گیا تاکہ وہ لوگ چھٹ کر الگ ہو جائیں جو معلومات اور تکرار کی اصطلاحوں میں پڑے ہوئے ہیں اور وہ انسان چن لئے جائیں جن کے لئے قرآنی حقیقتیں لذت روح کا درجہ حاصل کرچکی ہوں۔

قرآن ایک دعوتی کتاب

قرآن عام طرز کی علمی تصنیف نہیں، وہ ایک دعوتی کتاب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندے کو ساتویں صدی عیسوی کے ثلث اول میں ایک خاص قوم کے اندر اپنا نمائندہ بنا کر کھڑا کیا اور اس کو اپنے پیغام کی پیغام بری پر مامور فرمایا۔ اس پیغمبر نے اپنے ماحول میں یہ کام شروع کیا اور اسی کے ساتھ قرآن کا تھوڑا تھوڑا حصہ حسب ضرورت اس کے اوپر اترتا رہا۔ یہاں تک کہ ۲۳ سال میں پیغمبر کے دعوتی کام کی تکمیل کے ساتھ قرآن کی بھی تکمیل ہوگئی۔

قرآن اگرچہ خدا کی ابدی رہنمائی ہے مگر مذکورہ ترتیب نے اسی کے ساتھ اس کو تاریخی کتاب بھی بنا دیا ہے۔ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ابدی رہنمائی کو تاریخ کے سانچہ میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ ایسی حالت میں بعد کے زمانہ میں قرآن کی تفسیر کرنا آدمی کو ایک نئے مسئلہ سے دوچار کر دیتا ہے۔ قرآن کی تفسیر اگر اس ابتدائی پس منظر کی روشنی میں کی جائے جس میں قرآن کے احکام اترے تھے تو قرآن قدیم زمانہ کی ایک تاریخی کتاب معلوم ہوگی۔ اس کے برعکس قرآن کی تفسیر اگر اس کی ابدی اہمیت کی بنیاد پر کی جائے تو اس کا تاریخی پہلو مجروح ہوتا ہوا دکھائی

دیتا ہے۔ اس مسئلہ کی وجہ سے بعد کے زمانہ میں قرآن کی تفسیر کرنا ایک ایسا کام بن گیا ہے جس میں دوگونہ پہلوؤں کو نبھانا ضروری ہو۔

تذکیر القرآن میں یہی دوگونہ انداز اختیار کیا گیا ہے۔ اس میں تاریخی پس منظر بھی مختصر طور پر دکھایا گیا ہے مگر اس طرح نہیں کہ قرآن ایک تاریخی کتاب معلوم ہونے لگے۔ اسی طرح اس میں قرآنی تعلیمات کو آج کے حالات کے مطابق کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے۔ مگر ایسا نہیں کہ قرآن اپنی تاریخی بنیاد سے بالکل علیحدہ ہو جائے۔

قرآن کا مقصد نزول

قرآن کس لئے اتارا گیا ہے، ایک لفظ میں اس کا جواب یہ ہے کہ انسان کے بارے میں خدا کی اسکیم کو بتانے کے لئے۔ انسان کو خدا نے ابدی مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا ہے۔ موجودہ محدود دنیا میں پچاس سال یا سو سال گزار کر اس کو آخرت کی دنیا میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ جہاں اس کو مستقل طور پر رہنا ہے۔ موجودہ دنیا عمل کرنے کی جگہ ہے اور آخرت کی دنیا اس کا انجام پانے کی جگہ۔ آج کی زندگی میں آدمی جیسا عمل کرے گا اسی کے مطابق وہ اپنی اگلی زندگی میں اچھا یا برا بدلہ پائے گا۔ کوئی اپنی نیک کرداری کے نتیجہ میں ابدی طور پر جنت میں جائے گا اور کوئی اپنی بدکرداری کی وجہ سے ابدی طور پر جہنم میں۔ قرآن اس لئے اتارا گیا کہ اس سنگین مسئلہ سے آدمی کو باخبر کرے اور اس کو بتائے کہ اگلی زندگی میں برے انجام سے بچنے کے لئے اسے اپنی موجودہ زندگی میں کیا کرنا چاہئے۔

خدا نے انسان کو فہم و شعور کے اعتبار سے اسی صحیح فطرت پر پیدا کیا ہے جو اس کو انسانوں سے مطلوب ہے۔ پھر اس نے گرد و پیش کی پوری کائنات کو مطلوبہ درست کردار کا عملی مظاہرہ بنا دیا ہے۔ تاہم یہ سب کچھ خاموش زبان میں ہے۔ انسانی فطرت احساسات کی صورت میں اپنا کام کرتی ہے اور فطرت کے مظاہر تمثیل کی صورت میں۔ قرآن اس لئے آیا کہ فطرت اور کائنات میں جو کچھ خاموش زبان میں موجود ہے وہ نطق کی زبان میں اس کا اعلان کر دے تاکہ کسی کے لئے اس کا سمجھنا مشکل نہ رہے۔ فطرت اور کائنات اگر آدمی کی خاموش رہنما ہیں تو قرآن ایک ناطق رہنما۔

مزید یہ کہ قرآن ایک ایسے پیغمبر پر اتارا گیا جو غلبہ کا پیغمبر تھا۔ پچھلے انبیاء صرف داعی کی حیثیت سے بھیجے گئے۔ ان کا کام اس وقت ختم ہو جاتا تھا جب کہ وہ اپنی مخاطب قوم کو خدا کی مرضی سے پوری طرح آگاہ کر دیں۔ انھوں نے اپنی مخاطب قوموں کی زبان میں کلام کیا۔ مگر انسان نے اپنی آزادی کا غلط استعمال کرتے ہوئے ان کی بات نہیں مانی۔ اس طرح پچھلے زمانوں میں خدا کی مرضی انسان کی زندگی میں عملی صورت اختیار نہ کر سکی۔ پیغمبر آخر الزماں کو خدا نے غلبہ کی نسبت دی۔ یعنی آپ کے لئے فیصلہ کر دیا کہ آپ کا مشن صرف پیغام رسانی پر ختم نہ ہوگا بلکہ خدا کی خصوصی مدد سے اس کو عملی واقعہ بننے تک پہنچایا جائے گا۔ اس خدائی فیصلہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ خدا کے دین کے حق میں ہمیشہ کے لئے ایک مزید تائیدی بنیاد فراہم ہو گئی، یعنی مذکورہ بالا اہتمام کے علاوہ انسان کی حقیقی زندگی میں خدا کی مرضی کا ایک کامل عملی نمونہ۔

پچھلے زمانہ میں خدا کے جتنے پیغمبر آئے وہ سب اسی دعوت کو لے کر آئے جس کو لے کر پیغمبر آخر الزماں کو بھیجا گیا تھا۔ مگر پچھلے پیغمبروں کے ساتھ عام طور پر ایسا ہوا کہ لوگوں نے ان کے پیغام کو نہ مانا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس کو اپنی

دنیوی مصلحتوں کے خلاف سمجھتے تھے۔ ان کو غلط طور پر یہ اندیشہ تھا کہ اگر انھوں نے خدا کے سچے دین کو پکڑا تو ان کی بنی بنائی دنیا تباہ ہو جائے گی۔ قرآن کی تاریخ اس اندیشہ کی عملی تردید ہے۔ قرآن کے ذریعہ جو تحریک چلائی گئی اس کو خدا نے اپنی خصوصی نصرت کے ذریعہ دعوت سے شروع کر کے واقعہ بننے کے مرحلہ تک پہنچایا اور اس کے عملی نتائج کو دکھا دیا۔ اس طرح خدا کے دین کی ایک مستقل تاریخ وجود میں آگئی۔ اب قیامت تک لوگ حقیقی تاریخ کی زبان میں دیکھ سکتے ہیں کہ خدا کے سچے دین کو اختیار کرنے کے نتیجہ میں کس طرح زمین و آسمان کی تمام برکتیں نازل ہوتی ہیں۔

پھر اسی کے ذریعہ قرآن کی مستقل حفاظت کا انتظام بھی کر دیا گیا۔ ایک بڑے جغرافیہ میں اہل اسلام کا اقتدار اور وہاں اسلامی تہذیب و تمدن کا غلبہ اس بات کی ضمانت بن گیا کہ قرآن کو ایسا حفاظتی ماحول مل جائے جہاں کوئی اس میں کسی قسم کی تبدیلی پر قادر نہ ہو سکے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کا غلبہ تقریباً ڈیڑھ ہزار سال سے قرآن کا چوکیدار بنا ہوا ہے۔

ربانی دسترخوان

قرآن کو کچھ لوگ فضائل کی کتاب سمجھتے ہیں، کچھ لوگ مسائل کی کتاب اور کچھ لوگ سیاست کی کتاب۔ تینوں باتوں میں جزئی صداقت ہے مگر ان میں سے کوئی بھی قرآن کی صحیح تعبیر نہیں۔

قرآن کو فضائل کی کتاب ماننے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی آیتوں اور سورتوں میں طلسماتی برکتیں چھپی ہوئی ہیں۔ اور قرآن کے محض الفاظ کو دہرا لینا ان برکتوں کے حصول کے لئے کافی ہے۔ اگر اس بات کو مان لیا جائے تو قرآن کی وہ تمام آیتیں بے معنی ہو جاتی ہیں جن میں آدمی کو غور کرنے پر ابھارا گیا ہے۔ قرآن ایسی آیتوں سے بھرا ہوا ہے جو آدمی کو اکساتی ہیں کہ وہ الفاظ سے گزر کر معانی کی گہرائی میں اترنے کی کوشش کرے۔ وہ قرآن میں تدبر کرے اور قرآنی زاویۂ نگاہ سے اپنے آپ کو اور کائنات کو دیکھے۔ ان تعلیمات کی روشنی میں دیکھئے تو قرآن کا مقصد ایسے انسان پیدا کرنا ہے جن کی فکری قوتیں بیدار ہوں، جو قرآن سے ذہنی غذا حاصل کریں اور عبرت کی نگاہ کے ساتھ دنیا میں زندگی گزاریں۔ ایسی حالت میں قرآن کو فضائل کی کتاب کہنا قرآن کی تصغیر ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن ذہنوں کو کھولنے والی کتاب نہیں۔ وہ صرف برکت کی کتاب ہے جس کو بند ذہن کے ساتھ پڑھا جائے اور پھر بند غلاف میں محفوظ کر کے رکھ دیا جائے۔

اسی طرح قرآن کو مسائل کی کتاب کہنا بھی قرآن پر ظلم کرنا ہے۔ "مسائل" کے لفظ سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ قرآن ایسے اعمال کی کتاب ہے جن کو ظاہری آداب کے ساتھ ادا کر لینا کافی ہو۔ حالانکہ قرآن میں اس کے مطلوب اعمال کے ظاہری آداب کا ذکر ہی نہیں۔ قرآن آدمی کو ایمان کی دعوت دیتا ہے مگر وہ اس ایمان کو ایمان نہیں مانتا جو داخل القلب ایمان نہ ہو، جس میں صحت مخارج کے ساتھ بس کلمۂ ایمان کے الفاظ کو دہرا دیا گیا ہو۔ قرآن کے نزدیک حقیقی ایمان وہ ہے جو روح میں اتر جائے، جس میں آدمی کے دل کی دھڑکنیں شامل ہو جائیں۔ قرآن نماز کو فلاح کا ذریعہ بتاتا ہے مگر قرآن کی مطلوب نماز وہ ہے جو خشوع کی نماز ہو نہ کہ سہو کی نماز۔ قرآن چاہتا ہے کہ لوگ اللہ کا ذکر کریں۔ مگر وہ ذکر نہیں جو تکرار لسان کے طور پر ہوتا ہے بلکہ ایسا ذکر جس میں وہ والہانہ شیفتگی شامل ہو جو قومی ہیروؤں کے ذکر میں ہوتی ہے بلکہ اس

سے بھی بڑھ کر۔ قرآن کے نزدیک قربانی بہت بڑا عمل ہے مگر وہ قربانی نہیں جو گوشت اور خون کے ہم معنی ہو بلکہ وہ قربانی جو آدمی کے لئے تقویٰ کا ذریعہ بن جائے۔ اس طرح کے بے شمار احکام ہیں جو بتاتے ہیں کہ قرآن معروف معنوں میں مسائل کی کتاب نہیں بلکہ حقیقت کی کتاب ہے۔ وہ انسان کے اندر زندہ عمل دیکھنا چاہتا ہے نہ کہ محض ظاہری آداب و قواعد والا عمل۔

قرآن میں یقیناً بعض سیاسی نوعیت کے احکام ہیں۔ مگر قرآن کو کتاب سیاست سمجھنا ایسا ہی ہے جیسے بعض جزئی مشابہت کی بنا پر انسان کو معاشی حیوان سمجھنا۔ اس نقطۂ نظر کے حاملین یہ دیکھتے ہیں کہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ یہ واقعہ ہوا کہ دعوت و تبلیغ سے شروع ہو کر آپ کا مشن حکومت و سیاست تک پہنچا۔ اس بنا پر وہ کہتے ہیں کہ خدا کے پیغمبر اس لئے آتے ہیں کہ مخصوص احکام کی بنیاد پر خدا کی حکومت قائم کریں۔ مگر قرآن سے یہ ثابت ہے کہ خدا کی طرف سے جتنے پیغمبر آئے ان کا مشن الگ الگ نہ تھا بلکہ سب کا مشن ایک تھا۔ حتیٰ کہ قرآن میں پچھلے نبیوں کا ذکر کر کے نبی آخر الزماں سے کہا گیا ہے کہ تم بھی انھیں کی پیروی کرو (فبھداھم اقتدہ) ایسی حالت میں یہ سوال ہے کہ جب نبیوں کا مشن خدائی حکومت قائم کرنا ہوتا ہے تو آخری نبی کے سوا دوسرے نبیوں نے بھی آپ کی طرح حکومت کیوں نہ قائم کی۔

اس نقطۂ نظر کے حاملین اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ عمل کی حد تک تمام نبیوں نے خدائی حکومت کے قیام کے لئے جد و جہد کی۔ البتہ کسی کا عمل کوشش کے مرحلہ میں رہ گیا اور کسی کا عمل آخری نتیجہ تک پہنچا۔ مگر یہ جواب متعدد وجوہ سے غلط ہے۔ مثال کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو لیجئے۔ اگر آنجناب کا مشن یہ تھا کہ مصر کے اقتدار سے فرعون کو بے دخل کر کے وہاں خدائی قانون کی حکومت قائم کریں تو ایسا کیوں ہوا کہ جب خدا نے فرعون کو ہلاک کر دیا اور اس کی پوری جنگی طاقت کو سمندر میں غرق کر دیا تو حضرت موسیٰ مصر کو چھوڑ کر صحرائے سینا میں چلے گئے۔ اگر آپ کا مشن مصر میں حکومت الٰہیہ قائم کرنا تھا تو فرعون کی غرقابی کے بعد مصر میں اس کا پورا موقع آپ کے لئے کھل چکا تھا۔ ایسی حالت میں مصر کو چھوڑ کر چلے جانے کی کیا توجیہہ کی جائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن خدائی نعمتوں کا ابدی خزانہ ہے، قرآن خدا کا تعارف ہے۔ قرآن بندے اور خدا کا مقام ملاقات ہے۔ مگر اس قسم کے مفروضہ خیالات نے قرآن کو لوگوں کے لئے ایک ایسی کتاب بنا دیا جو یا تو ایک چٹیل زمین ہے جہاں آدمی کی روح کے لئے کوئی غذا نہیں یا وہ کسی شاعر کے مجموعہ کلام کی طرح ایک ایسا لفظی مجموعہ ہے جس سے ہر آدمی بس اپنے مخصوص ذہن کی تصدیق حاصل کر لے۔ وہ اصلاً خود اپنے آپ کو پائے اور یہ سمجھ کر خوش ہو کہ اس نے خدا کو پا لیا ہے۔

قرآن فہمی کے شرائط

قرآن ایک فکری کتاب ہے اور فکری کتاب میں ہمیشہ ایک سے زیادہ تعبیر کی گنجائش رہتی ہے۔ اس لئے قرآن کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پڑھنے والا خالی الذہن ہو۔ اگر پڑھنے والے کا ذہن خالی نہ ہو تو وہ قرآن میں خود

اپنی بات پڑھے گا۔ اس کو سمجھنے کے لئے قرآن کی ایک آیت کی مثال لیجئے:

ومن الناس من یتخذ من دون اللہ انداد ا یحبونھم کحب اللہ والذین آمنوا اشد حبا للہ بقرہ ۱۶۵	کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا مدمقابل بناتے ہیں اور ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی محبت اللہ کے ساتھ ہونا چاہئے۔ حالاں کہ ایمان رکھنے والے سب سے زیادہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔

ایک شخص جو سیاسی ذوق رکھتا ہو اور سیاسی اکھیڑ پچھاڑ کو کام سمجھتا ہو وہ جب اس آیت کو پڑھے گا تو اس کا ذہن پوری آیت میں بس انداد (مدمقابل) پر رک جائے گا۔ وہ قرآن سے "مدمقابل" کا لفظ لے لے گا اور بقیہ مفہوم کو اپنے ذہن سے جوڑ کر کہے گا کہ اس سے مراد سیاسی مدمقابل ٹھہرانا ہے، اس آیت میں کہا گیا ہے کہ آدمی کے لئے جائز نہیں کہ وہ کسی کو خدا کا سیاسی مدمقابل بنائے۔ اس تشریح کے مطابق یہ آیت اس کے لئے اس بات کا اجازت نامہ بن جائے گی کہ جس کو وہ خدا کا "سیاسی مدمقابل" بنا ہوا دیکھے اس سے ٹکراؤ شروع کر دے۔ اس کے برعکس جو آدمی سادہ ذہن کے ساتھ اس کو پڑھے گا وہ "انداد" کے لفظ پر نہیں رکے گا بلکہ پوری آیت کی روشنی میں اس کا مفہوم متعین کرے گا۔ ایسے شخص کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگے گی کہ یہاں مدمقابل ٹھہرانے کی جس صورت کا ذکر ہے وہ باعتبار محبت ہے نہ کہ باعتبار سیاست۔ یعنی آیت یہ کہہ رہی ہے کہ آدمی کو سب سے زیادہ محبت صرف خدا سے کرنا چاہئے۔ "حب شدید" کے معاملہ میں کسی دوسرے کو خدا کا ہمسر نہیں بنانا چاہئے۔

قرآن کا ایک عمومی مفہوم ہے اور اس کو سمجھنے کی شرط یہ ہے کہ آدمی خالی الذہن ہو کر قرآن کو پڑھے۔ مگر جو شخص قرآن کے گہرے معانی تک پہنچنا چاہے اس کو ایک اور شرط پوری کرنی پڑتی ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ اس راہ کا مسافر بنے جس کا مسافر اس کو قرآن بنانا چاہتا ہے۔ قرآن آدمی کی عملی زندگی کی رہنما کتاب ہے اور کسی عملی کتاب کو اس کی گہرائیوں کے ساتھ سمجھنا اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ آدمی عملاً ان تجربات سے گزرے جن کی طرف اس کتاب میں رہنمائی کی گئی ہے۔

یہ عمل کوئی سیاسی یا سماجی عمل نہیں ہے بلکہ مکمل طور پر ایک نفسیاتی عمل ہے۔ اس عمل میں آدمی کو خود اپنے نفس کے مقابلہ میں کھڑا ہونا پڑتا ہے نہ کہ حقیقتہً کسی خارج کے مقابلہ میں۔ قرآن چاہتا ہے کہ آدمی ظاہری دنیا کی سطح پر نہ جئے بلکہ غیب کی دنیا کی سطح پر جئے۔ اس سلسلے میں جن مراحل کی نشان دہی قرآن میں کی گئی ہے ان کو وہ شخص کیسے سمجھ سکتا ہے جو ان مراحل سے آشنا نہ ہوا ہو۔ قرآن چاہتا ہے کہ آدمی صرف اللہ سے ڈرے اور صرف اللہ سے محبت کرے۔ اب جس کا دل اللہ کی محبت میں نہ تڑپا ہو، جس کے بدن کے رونگٹے اللہ کے خوف سے نہ کھڑے ہوئے ہوں وہ کیسے جان سکتا ہے کہ اللہ سے ڈرنا کیا ہے اور اللہ سے محبت کرنا کیا۔ قرآن چاہتا ہے کہ آدمی خدائی مشن میں اپنے آپ کو اس طرح شامل کرے کہ وہ اس کو اپنا ذاتی مسئلہ بنا لے۔ اب جس شخص نے خدا کے کام کو اپنا ذاتی کام نہ بنایا ہو وہ کیوں کر جانے گا کہ خدا کے ساتھ اپنے کو شامل کرنے کا مطلب کیا ہے۔ قرآن یہ چاہتا ہے کہ آدمی انسانوں کے چھیڑے ہوئے مسائل میں گم نہ ہو بلکہ خدا کی طرف سے برسنے والے فیضان میں اپنے کو گم کرے۔ اب جس شخص پر ایسے صبح و شام ہی نہ گزرے ہوں جب کہ خدا کے فیضان

میں وہ نہا اٹھے وہ کیسے سمجھ سکتا ہے کہ خدائی فیضان میں نہانے کا مطلب کیا ہے۔ قرآن چاہتا ہے کہ آدمی جہنم سے بھاگے اور جنت کی طرف دوڑے۔ اب جو شخص اس طرح زندگی گزارے کہ جہنم کو اس نے اپنا مسئلہ نہ بنایا ہو اور جنت اس کی ضرورت نہ بنی ہو اس کو کیا معلوم کہ جہنم سے بھاگنا کیا ہوتا ہے اور جنت کی طرف دوڑنا کیا معنی رکھتا ہے۔ قرآن چاہتا ہے کہ آدمی اللہ کی عظمت و کبریائی کے احساس سے سرشار ہو۔ اب جو شخص اپنی عظمت و کبریائی کے مینار میں لذت لے رہا ہو اس کو اس کیفیت کا ادراک کہاں ہو سکتا ہے جب کہ آدمی خدا کی کبریائی کو اس طرح پاتا ہے کہ اپنی طرف اس کو عجز کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

قرآنی عمل اصلاً نفس یا انسان کے اندرونی وجود کی سطح پر ہوتا ہے۔ مگر انسان کسی خلا میں زندگی نہیں گزارتا بلکہ دوسرے بہت سے انسانوں کے درمیان رہتا ہے۔ اس لئے قرآنی عمل باعتبار حقیقت ذاتی عمل ہونے کے باوجود، دو پہلوؤں سے دوسرے انسانوں سے بھی متعلق ہو جاتا ہے۔ ایک اس اعتبار سے کہ آدمی جس قرآنی راستہ کو خود اپناتا ہے اسی راستہ کو اختیار کرنے کی وہ دوسروں کو بھی دعوت دیتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں ایک آدمی اور دوسرے آدمی کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ قائم ہوتا ہے۔ یہ رشتہ آدمی کو بے شمار تجربات سے گزارتا ہے جو مختلف صورتوں میں آخر وقت تک جاری رہتا ہے۔ دوسرے یہ کہ مختلف قسم کے انسانوں کے درمیان زندگی گزارتے ہوئے طرح طرح کے تعلقات و معاملات پیش آتے ہیں۔ کسی سے لینا ہوتا ہے اور کسی کو دینا، کسی سے اتفاق ہوتا ہے اور کسی سے اختلاف، کسی سے دوری ہوتی ہے اور کسی سے قربت۔ ان مواقع پر آدمی کیا رویہ اختیار کرے اور کس قسم کا ردعمل پیش کرے، قرآن ان امور میں اس کی مکمل رہنمائی کرتا ہے۔ اگر آدمی اپنی خواہش پر چلنا چاہے تو قرآن کا یہ باب اس پر بند رہے گا اور اگر وہ اپنے کو قرآن کی ماتحتی میں دیدے تو اس پر قرآنی تعلیمات کے ایسے بھید کھلیں گے جو کسی اور طرح اس پر کھل نہیں سکتے۔

قرآن آدمی کو جو مشن دیتا ہے وہ حقیقۃً کوئی "نظام" قائم کرنے کا مشن نہیں ہے۔ بلکہ اپنے آپ کو قرآنی کردار کی صورت میں ڈھالنے کا مشن ہے۔ قرآن کا اصل مخاطب فرد ہے نہ کہ سماج۔ اس لئے قرآن کا مشن فرد پر جاری ہوتا ہے نہ کہ سماج پر۔ تاہم افراد کی قابل لحاظ تعداد جب اپنے آپ کو قرآن کے مطابق ڈھالتی ہے تو اس کے سماجی نتائج بھی لازماً نکلنا شروع ہوتے ہیں۔ یہ نتائج ہمیشہ یکساں نہیں ہوتے بلکہ حالات کے اعتبار سے ان کی صورتیں بدلتی رہتی ہیں۔ قرآن میں مختلف انبیاء کے واقعات انھیں سماجی نتائج یا سماجی ردعمل کے مختلف نمونے ہیں اور اگر آدمی نے اپنی آنکھیں کھول رکھی ہوں تو وہ ہر صورت حال کی بابت قرآن میں رہنمائی پاتا چلا جاتا ہے۔ ——— قرآن فطرت انسانی کی کتاب ہے۔ قرآن کو وہی شخص بخوبی طور پر سمجھ سکتا ہے جس کے لئے قرآن اس کی فطرت کا مثنیٰ بن جائے۔

تذکیر القرآن کی خصوصیات

۱۔ تذکیر القرآن کا خاص مقصد قرآن کی یاد دہانی ہے۔ قرآن کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ نصیحت ہے۔ تذکیر القرآن کی ترتیب میں سب سے زیادہ اسی پہلو کا لحاظ کیا گیا ہے کہ وہ پڑھنے والے کے لئے نصیحت بن سکے۔

۲۔ تذکیر القرآن کو تین حصوں پر تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر حصہ تقریباً دس پاروں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ سورہ فاتحہ سے

سورہ توبہ تک۔ دوسرا حصہ سورہ یونس سے سورہ عنکبوت تک۔ تیسرا حصہ سورہ روم سے سورہ ناس تک۔

۳۔ قرآن عام انسانی کتاب کی طرح ابواب کے انداز میں نہیں ہے بلکہ شذرات کے انداز میں ہے۔ اگرچہ قرآن کی سورتوں اور عبارتوں میں ایک گہری ترتیب بھی ہے۔ مگر اس کا عام انداز یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں ایک پورا پیغام ہے۔ ایک ایک "پیراگراف" میں ایک ایک بات ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ تذکیر القرآن میں اسی شذراتی انداز کو تشریح کے لئے اختیار کیا گیا ہے۔ یعنی قرآن کا ایک ٹکڑا یا ایک "پیراگراف" لے کر اس میں جو بات کہی گئی ہے اس کو ایک مرتب تشریح کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ ایسا اس لئے کیا گیا ہے تاکہ متعلقہ تشریح کو پڑھتے ہوئے قاری کے ذہن میں معانی کا سلسلہ نہ ٹوٹے اور وہ قرآن کی تذکیری غذا مسلسل لیتا چلا جائے۔

۲۔ تذکیر القرآن کی ترتیب یہ رکھی گئی ہے کہ پہلے قرآن کا زیر تشریح ٹکڑا (پیراگراف) درج کیا گیا ہے۔ اس کے نیچے اس کا ترجمہ ہے۔ ترجمہ کے بعد ایک لکیر دے کر متعلقہ ٹکڑے کی تشریح ہے۔ جہاں تشریح ختم ہوتی ہے وہاں پھر قرآن کا اگلا ٹکڑا درج کر کے دوبارہ مذکورہ ترتیب سے ترجمہ اور تشریح درج ہے۔ اسی طرح ایک کے بعد ایک پوری سورہ کی تفسیر ہے۔ اس ترتیب میں قاری ہر تشریح کو پڑھتے ہوئے بیک وقت اس کا متن بھی سامنے رکھ سکتا ہے اور اسی کے ساتھ اس کا ترجمہ بھی۔

۱۔ تذکیر القرآن میں یہ حکمت ملحوظ رکھی گئی ہے کہ ہر صفحہ پر ایک پوری بات آجائے۔ آدمی اگر ایک صفحہ پڑھے تب بھی قرآنی نصیحت کا کوئی حصہ اسے مل جائے اور زیادہ صفحات پڑھے تب بھی۔

۔ ترتیب یہ رکھی گئی ہے کہ صفحہ کے اوپر قرآن کے ایک ٹکڑے (پیراگراف) کا ترجمہ ہے۔ اس کے بعد ایک لکیر دے کر اس کے نیچے تفسیر ہے۔ ان چند آیتوں میں جو باتیں کہی گئی ہیں ان باتوں کا حد درجہ پابند رہتے ہوئے ان کو ایک مسلسل مضمون کی صورت میں اس طرح لکھا گیا ہے کہ ہر صفحہ کی تفسیر اسی صفحہ پر ختم ہو جائے۔

۔ تذکیر القرآن میں ترجمہ کا جو انداز اختیار کیا گیا ہے وہ نہ پوری طرح لفظی ہے اور نہ پوری طرح بامحاورہ۔ بلکہ درمیان کی ایک صورت اختیار کی گئی ہے۔ دونوں ہی انداز کے اپنے اپنے فائدے ہیں اور درمیانی انداز اس لئے اختیار کیا گیا ہے کہ دونوں پہلوؤں کی رعایت شامل رہے۔

۔ تفسیر میں عام طور پر تفصیل سے پرہیز کیا گیا ہے۔ زیادہ تر جو چیز پیش نظر رکھی گئی ہے وہ یہ کہ قرآن کی فطری سادگی اس کی تفسیر میں بھی باقی رہے۔ قرآن ایک طرف خدا کے جلال کا اظہار ہے اور دوسری طرف وہ انسان کی عبدیت کا آئینہ ہے۔ تفسیر میں بس انھیں اصل پہلوؤں کو غیر فنی انداز میں نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

وحیدالدین جمعہ ۱۳ نومبر ۱۹۸۱

نئی مطبوعات اسلامی مرکز

تذکیر القرآن جلد اول (سورہ فاتحہ تا سورہ توبہ) قیمت مجلد	۵۰	روپے
محمدی آئیڈیل کیرکٹر (MUHAMMAD: The Ideal Character)	۳	″
اتحاد ملت	۳	″
راہیں بند نہیں	۳	″
سبق آموز واقعات	۳	″
دین کی سیاسی تعبیر (زیادہ تعداد منگانے پر خصوصی کمیشن)	۲	″
تعارفی سٹ : سچا راستہ	ایک	″
دینی تعلیم	۳	″
حیات طیبہ (زیر طبع)	۳	″
باغ جنت	۳	″
نار جہنم	۳	″

مکتبہ الرسالہ

ہفتہ وار اجتماعات

بھوپال کے اجتماع میں جو باتیں طے ہوئی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہر مقام پر الرسالہ کے حلقے اپنے آپ کو اسلامی مرکز کے حلقہ میں تبدیل کر لیں اور ہفتہ وار اجتماع کا نظم شروع کر دیں۔ ہم ہر مقام کے الرسالہ کے ہمدردوں سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ اپنے یہاں ہفتہ وار اجتماع شروع کر دیں اور خط و کتابت کے ذریعہ ضروری مشورے حاصل کریں۔

وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

دفتر الرسالہ منتقلی۔ جمعیۃ بلڈنگ۔ قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی ۶

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دل چسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زرتعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت —— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کر کے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت —— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ ۱۳۵ روپے یا ماہانہ ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

دن میں برات چڑھ رہی ہے

- ہاں یہ ایک اچھی رسم شروع ہوئی ہے۔ بیکار کا دکھاوا اور بجلی کا فضول استعمال بھلا کہاں کی عقلمندی ہے۔ جب کوئی بیچارا بیٹی والا جہیز کی پھانسی کے تختے پر چڑھ رہا ہوتا ہے تو اسے روشنیوں کا ایک ایک بلب بچھو کے ڈنک کی طرح کاٹتا ہے۔
- ہم جہیز کو گناہ سمجھتے ہیں، تبھی تو لوگ چوری چھپے جہیز لینے دینے لگے ہیں۔ مگر یہ فضول کی تزک بھڑک بھی بند ہونی چاہئے۔ سماج کے لئے بجلی اتنی ہی ضروری ہے جتنا جسم کے لئے خون۔ کیا کوئی ناحق اپنا خون بہاتا ہے۔
- 1980-81 ء میں ہم نے 118 ارب 50 کروڑ یونٹ بجلی پیدا کی تھی۔
1981-82 ء میں ہمارا نشانہ 130 ارب یونٹ بجلی تیار کرنے کا ہے۔ مگر منزل ابھی دور ہے۔

سماجی برائیاں دور کرنا اور ملک کے مفاد کے لئے محنت کرنا ہمارا سب سے بڑا فرض ہے۔

نیا 20 نکاتی پروگرام

تفصیلی معلومات کے لئے درج ذیل کوپن استعمال کریں:

ڈپٹی ڈائریکٹر،
ماس میلنگ یونٹ،
ڈائریکٹوریٹ آف ایڈورٹائزنگ اینڈ وژول پبلسٹی،
بی۔ بلاک اکستوربا گاندھی مارگ، نئی دہلی 110001

نئے 20 نکاتی پروگرام سے متعلق معلوماتی کتابچہ اردو/ہندی/انگریزی میں بھیجیں۔

نام - - - - - - - - - - - - - - - - - -

پتہ - - - - - - - - - - - - - - - - پن نمبر - - - -

davp 81 383

REGD. R. N. NO. 28622/76
REGD.NO. D. (DN) 532

ISSUE NO. 68
JULY 1982

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING QASIMJAN STREET DELHI-110006 (INDIA) PHONE 232231

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

۱- الاسلام	۱۵-۰
۲- مذہب اور جدید چیلنج	۱۵-۰
۳- ظہورِ اسلام	۱۵-۰
۴- دین کیا ہے؟	۲-۰
۵- قرآن کا مطلوب انسان	۵-۰
۶- تجدیدِ دین	۳-۰
۷- اسلام دینِ فطرت	۳-۰
۸- تعمیرِ ملت	۳-۰
۹- تاریخ کا سبق	۳-۰
۱۰- مذہب اور سائنس	۵-۰
۱۱- عقلیاتِ اسلام	۳-۰
۱۲- فسادات کا مسئلہ	۲-۰
۱۳- انسان اپنے آپ کو پہچان	۱-۰
۱۴- تعارفِ اسلام	۲-۵۰
۱۵- اسلام پندرھویں صدی میں	۲-۰
۱۶- راہیں بند نہیں	۳-۰
۱۷- دینی تعلیم	۳-۰
۱۸- ایمانی طاقت	۳-۰
۱۹- اتحادِ ملت	۳-۰
۲۰- سبق آموز واقعات	زیرِ طبع
۲۱- اسلامی تاریخ سے	"
۲۲- قال اللہ	"
۲۳- اسلامی دعوت	۳-۰
۲۴- زلزلۂ قیامت	۴-۰
۲۵- سچا رامائنہ	۱-۰

مکتبہ الرسالہ - دہلی-۶